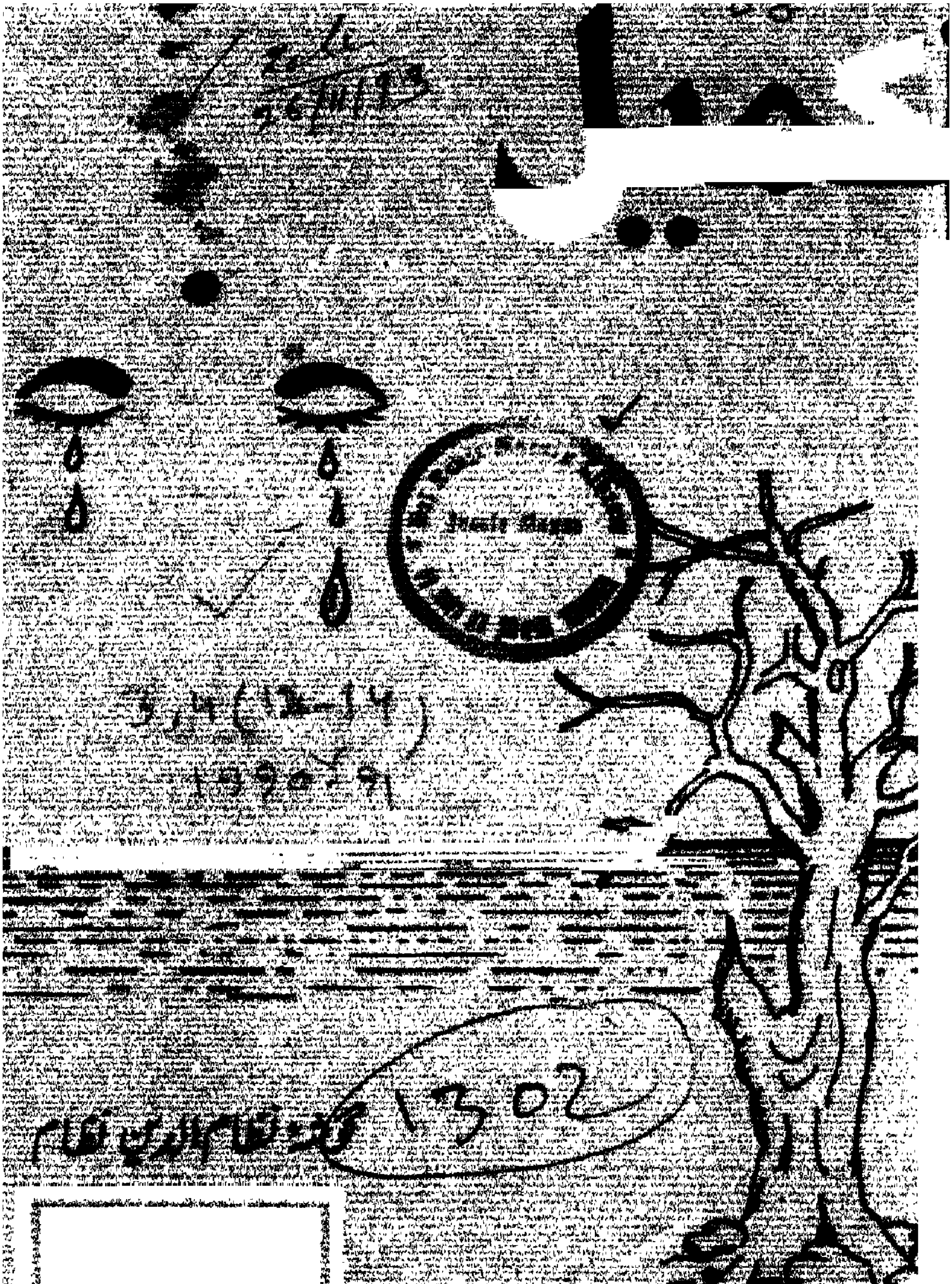
DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.



"گوشۂ مقدر حمید" کی مقبولیت کے بعد

جدید نسل کے معروف شاعر

نظام الدین نظام

پر

تکمیل کا ایک اور جرأت مندانہ قدم

گوشۂ نظام کی اشاعت پر دلی مبارکباد

من جانب

اظہار احمد

خصوصی نامہ نگار اخبار [illegible]

عصری ادب کا منظر نامہ

سہ ماہی تکمیل بھیونڈی

جلد: ۳۰، ۳۱ — شمارہ ۱۲ تا ۱۴ — ڈسمبر ۱۹۹۰ء تا جون ۱۹۹۱ء

مدیر اعلا ———— اصغر حسین قریشی

مدیر ———— مظہر سلیم

رابطہ : گلزار نگر، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی، ۴۲۱۳۰۲، تھانے (ایم۔ایس)
: تکنتی دیلی چال، C/15/11، دلو بابھادے نگر، پاپ روڈ، کرلا، بمبئی ۷۰

قیمت فی شمارہ : ۷ چھے روپے
اس شمارے کی قیمت : ۱۲ بارہ روپے

زرسالانہ ۲۵ پچیس روپے

قاسم امام، سلیم انصاری، شیدا بھونوی، میم۔ فاروق
سرور ساجد، سمیع الدین اظہر، آتما رام

مزاحیہ

عبدالرحیم نشتر ــــ ظ انصاری ــــ اچھوتی طرز ادا ــــ
عین دت ــــ کُتّے ــــ

گوشۂ نظام الدّین نظامؔ

انتخابِ کلام ــــ
عزیز قیسی ــــ نظامؔ کی شاعری، منی اور میڈیم شعریات
قیصر الجعفری ــــ غزل کی سرحدیں اور نظامؔ ــــ
انور خان ــــ برہنہ اسلوب کی شاعری اور نظامؔ ــــ
جاوید ناصر ــــ لب و لہجہ ــــ
عبدالاحد ساز ــــ نظام الدّین نظامؔ، اپنی نظموں کی فضا میں ــــ
ضمیر کاظمی ــــ نظامؔ ــ ایک باغیانہ نظامِ فکر ــــ

ردِّ عمل ــ تبصرے

یوسف ناظم، ایم۔ مبین، عین دت ــــ

چہل پہل

مرتّب ــ مقصود اظہر ــــ خبریں ــــ

ہدایت نامے

ــــ قارئین کے خطوط ــــ

پرنٹر، پبلی شر، اصغر حسین قریشی نے سیماب پریس کھام گاؤں کے لیے مگدا آفسیٹ پریس بمبئی ۱۱ سے چھپوا کر گلزار نگر غیبی پیر روڈ بھیونڈی سے شائع کیا۔

کتابت: سید سلیم اور ذوالقاف

سفر

پڑاؤ
اداریہ

تصویریں بولتی ہیں

نامے جلے ہوئے شہروں سے
خطوط

مضامین
عنوان چشتی — ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار

ڈاکٹر سید نعیم الدین — قرۃ العین حیدر کا سماجی شعور

انور ظہیر — انور قمر — ایک عمومی جائزہ

شاعر کی بیاض سے
جاوید ندیم — نظمیں

رام پنڈت — نظمیں

کہانیاں
ساگر سرحدی — اداسی

حسین الحق — فاختہ پوچھتی ہے

سلطان سبحانی — کاشانۂ خلیل

مشتاق رضا — کالی کرن

ہمارا انتخاب
ڈاکٹر محمد صابرین — اردو کی نئی نصابی کتابیں

شاعری
جگن ناتھ آزاد، حمید الماس، سلیم شہزاد، ایم کوٹھیاوی راہی،
مظہر الزماں خاں، فصیح اکمل، جینت پرمار، علی ظہیر،
ضیاالانجم، جلیل ساز، رئیس الدین رئیس، نسیم اجمیری

اردو ادب کی دو قدآور شخصیتیں ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور حسن نعیم اب ہم میں نہیں رہے۔ اردو ادب کی یہ بد قسمتی ہے کہ ایک ہی ماہ میں اردو کی دو عظیم اور عہد ساز شخصیتیں یکے بعد دیگرے ہم سے جدا ہو گئیں۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری اردو زبان و ادب کی ایک ناگزیر شخصیت تھے۔ وہ تنقید میں ایک الگ راہ کے موجد اور کسی حد تک خاتم بھی تھے۔ تحقیق کے مرد میداں اور صحافت و خطابت کی راہوں کے ایک مشّاق اور ماہر راہی تھے۔ موصوف کا ادبی سفر تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔ جس میں وہ اپنی تحریروں، خیالات اور فرمودات کی وجہ سے متنازعہ بھی رہے، وہیں انھوں نے اپنے طرزِ تحریر اور اسلوبِ نگارش سے اردو ادب کا دامن مالامال کیا۔

مرحوم نے غالبؔ اور خسروؔ پر تحقیق کے نئے باب کھولے، خطابت کا اپنا انداز اختیار کر کے اردو کی ادبی محفلوں میں جان ڈالی۔ مرحوم اپنے ادبی سفر میں مختلف اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے۔ اپنی صحافتی زندگی میں لکھے ہوئے اداریے طنز و مزاح، امرِ واقعہ اور حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرے آج بھی پڑھنے والوں کو روشنی دیتے ہیں۔ مرحوم کو اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور روسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ظ صاحب اپنے آخری دنوں تک ترقی پسند تحریک اور کمیونزم سے وابستہ رہے وہ خوش اخلاق، خوش اطوار، خوش گفتار، خوش سخن، مہذب اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔

اردو ادب کے لیے دوسرا سانحہ حسن نعیم کی رحلت ہے۔ مرحوم اردو غزل کے مزاج داں اور روایت کے پاس دار شاعر تھے، جنھوں نے اپنے مزاج اور اپنی بات پر قائم رہنے کی فطرت کی وجہ سے عملی زندگی میں کافی نقصان اٹھایا۔ حسن نعیم کی شاعری میں فکر اور جذبے کی ایسی پروقار آمیزش ہے جس سے ان کی غزلوں میں غنائیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ استعارہ سازی اور پیکر تراشی کے ہنر سے بھی خوب واقف تھے۔ وہ اپنی شاعرانہ شخصیت کی نشو و نما اور تکمیل کے لیے حکومتِ ہند کا وزارتِ خارجہ کے اعلا عہدے سے مستعفی ہو کر ہندستان لوٹ آئے اور گیسوئے غزل کے پیچ و خم کو

تکمیل

سلجھانے میں مصروف ہوگئے۔ دہلی سے بمبئی تک کے سفر میں انھوں نے اپنے تیکھے مزاج اور سیماب
کیفیت کی وجہ سے کچھ نقصان اٹھائے اور کبھی حالات سے مفاہمت بھی کی۔ دنیادارانہ مفاہمت
کا اثر ان کے کلام پر بھی پڑا۔ مرحوم کا صرف ایک مجموعہ کلام "اشعار" کے نام سے شائع ہو چکا ہے
جو کلاسیکی رچاؤ اور عصری تقاضوں سے بھرپور ہے؛ جدید اردو غزل کے شعری سفر میں سنگ میل
کی حیثیت رکھتا ہے۔

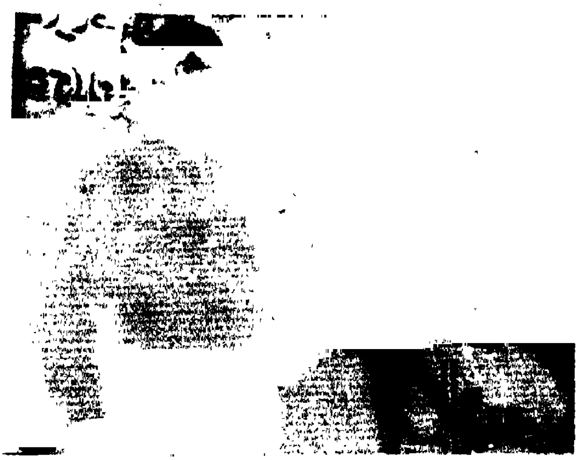
اردو ادب کا تیسرا المیہ سراج انور کی رحلت ہے۔ سراج انور نے بچوں کے ادب میں کافی
سرمایہ چھوڑا ہے، انھوں نے بڑوں کے لیے ناول اور ڈرامے لکھے، جن کی زبان بامحاورہ، سلیس
اور رواں ہے۔ ناولوں اور ڈراموں کے موضوعات ہندوستان کی عصری زندگی سے مستعار ہیں۔
وہ فوٹوگرافی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کے پیشے کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑا اور انھوں نے
اپنے ناولوں میں فوٹوگرافی کی تیکنک کو مدِنظر رکھ کر منظر نگاری کی ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری، حسن نعیم اور سراج انور کی رحلت اردو ادب کا عظیم نقصان ہے۔ مرحومین
اردو کی مختلف اصناف کے روشن مینار تھے اور ان کے بجھ جانے سے ادب میں جو تاریکی پھیلی ہے اسے
دور کرنا مشکل ہے۔ ادارہ دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان
کو صبر جمیل عطا کرے۔

چھپتے چھپتے

بمبئی میں حالیہ طوفانی بارش سے جہاں شہری زندگی مفلوج ہو گئی تھی
وہیں اس کا اثر ادارہ پر بھی پڑا۔ "سہ ماہی تکمیل" کے تمام فائل جن میں
کتابت شدہ اور زیر کتابت مسودات تھے پانی کے ساتھ بہہ گئے۔ اس طوفان نے ادارہ
کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس لیے شعراء و ادباء سے گزارش ہے کہ ہماری اس مجبوری کے
پیشِ نظر اپنی تخلیقات دوبارہ روانہ فرمائیں۔ ماہ مئی میں ادارہ کے نام جو خطوط اور تخلیقات بھیجی گئیں وہ بھی
سیلابی پانی کی نذر ہو گئیں۔

تصویریں بولتی ہیں



مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے پروگرام "غالب اور ہندوستان"
میں حاضرین سے مخاطب ڈاکٹر ظ۔ انصاری، علی سردار جعفری اور
مجروح سلطان پوری



حسن نعیم اور مجروح سلطان پوری ایک تقریب میں (۱۹۸۸ء)

نامے ـــــ جلے ہوئے شہروں سے

گذشتہ چند برسوں میں ملک فرقہ وارانہ فسادات اور مذہبی کشیدگی کی لپیٹ میں رہا۔ ہر گاؤں، قریہ، دیہات، تعصب اور نفرت کی آگ میں جلتے رہے، سلگتے رہے۔ ان شعلوں کو بجھانے کے لیے ہمارے پاس کوئی سادھن نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے جو مراعاتیں دی گئی ہیں وہ بہت کم ہیں۔ تحفظ اور عدم تحفظ نے ہمارے اندر قنوطیت اور اضطرابیت کو جنم دیا ہے۔ اور ہمارے مسائل کا حل صرف خدا ہے۔ آخر ہم کب تک ہاتھ اٹھا کر آسمان کی اور دیکھتے رہیں گے، اور کب تک غیبی مدد کا انتظار کریں گے۔ کیا ہمیں ماترِ بھومی (زمین) کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں؟ اور اگر ہے تو ہم زمینی مسائل کا حل آسمانوں میں کیوں کھوج رہے ہیں؟

ادارہ "تکمیل" ایسے ہی فساد زدہ شہروں میں گھرے ادیبوں، شاعروں دانشوروں اور فن کاروں کے خیالات، تفکرات، کرب اور بے چینیوں کو تحریری شکل میں حاصل کر کے جوں کا توں شائع کر رہا ہے۔ اس سے بہ خوبی اندازہ ہوگا کہ ہمارے ملک کا دانشور طبقہ بھی اب فکر مند ہو گیا ہے۔ مگر صرف یہ سوچ، یہ فکر کیا عام انسانوں کو موت کے منہ سے بچا سکے گی؟ ظلم و بربریت کے اس ننگے ناچ اور نسل کشی کے اس ڈرامے کو ختم کرنے کے لیے کوئی ہل چل، کوئی تحریک بھی چلے گی یا صرف آسمان کی طرف ہی دیکھا جاتا رہے گا۔

آج ہندوستان کا ہر باشندہ چاہے وہ کسی قوم و مذہب سے تعلق رکھتا ہو اپنے تحفظ اور عدم تحفظ کے مسئلے سے دوچار ہے۔ ہمیں امید ہے ادبا و شعرا "مکتبی سازشوں" اور کرسی کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے بغیر ٹھوس، تعمیری اور صحت مند سرگرمیوں کو جاری و ساری کریں گے اور عام انسانوں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کریں گے۔!!

دہلی

ڈاکٹر شارب ردولوی

تکمیل کا پہلا شمارہ بھی ملا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تک میں آپ کو کوئی مضمون نہیں بھیج سکا۔ گذشتہ دو تین ماہ سے ملک کے جو حالات ہیں ان میں نہ کچھ لکھ سکا ہوں اور نہ باقاعدگی سے کچھ پڑھ سکا ہوں۔

ڈاکٹر وحید الرحمٰن

آپ کا محبّت نامہ بتاریخ ۴ر دسمبر ۹۰ کا آج ۲۱ر جنوری ۹۱ء کو نظر نواز ہوا' تاخیر ہوئی تو سبب تاخیر بھی ہے۔ ادارے کے اور بالخصوص آپ کے خلوص و محبّت کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ دراصل یہی چیزیں زندگی کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

جہاں تک فسادات کا تعلق ہے تو یہ آگ تو ہمیشہ کہیں نہ کہیں لگی ہی رہتی ہے' اور لگتی ہی رہے گی کہ اس کی زد میں آئی ہوئی انسانیت کی راکھ سے اہل سیاست کے رخسار کا غازہ تیار ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اور میرا علاقہ اس سے محفوظ ہے۔

علی گڑھ

معین احسن جذبی

جب سے آپ کا گرامی نامہ ملا! اس وقت سے اب تک تیسری بار کرفیو نافذ ہو چکا ہے۔ پرسوں تیسری بار جو کرفیو نافذ ہوا ہے وہ غیر متعین وقت کے لیے ہے۔ کوئی نظر آجائے تو یہ حکم ہے کہ اسے فوراً گولی ماردی جائے' فوج بھی تھوڑی سی آگئی ہے۔ علی گڑھ کے اطراف میں جو گاؤں مسلم آبادی پر مشتمل ہیں ان کا برا حال ہے۔ لوگ بھاگ بھاگ کے یونیورسٹی کی طرف آرہے ہیں' شدید سردی

ہے اور لوگوں کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ پہننے اوڑھنے کو۔ چندے ہو رہے ہیں جو کچھ ہو سکتا ہے کیا جارہا ہے۔ ہاں! ایک خبر یہ ہے کہ یونیورسٹی بند کردی گئی ہے اور طالب علموں سے کہا جارہا ہے وہ ہوسٹل خالی کردیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے وائس چانسلر تو نہیں چاہتے کہ یونیورسٹی بند ہو۔ لیکن حکام ضلع اس پر مصر ہیں۔ دوسری طرف ٹرین کا سفر بھی کافی مخدوش ہے۔ ابھی حال ہی میں علی گڑھ آنے والی ایک ٹرین پر علی گڑھ کے قریب ہی روک کر حملہ کردیا گیا۔ کچھ جانیں ضائع ہوئیں۔ آپ نے علی گڑھ کے فسادات کے متعلق ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات میں جو کچھ دیکھا یا سُنا ہے۔ اس سے کئی زیادہ علی گڑھ والوں کو بھگتنا پڑا ہے۔ دعا کیجیے کہ خدا مسلمانوں اور مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کو محفوظ رکھے۔ آخر اقلیتیں کہاں جائیں گی۔ انھیں تو اسی ملک میں رہنا ہے۔ آدمی آدمی کا دشمن کیوں ہے؟ کیا جناح کا دو قومی نظریہ جسے میں آج بھی ماننے کے لیے تیار نہیں، صحیح تھا؟ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ہر شخص خوف وہراس میں مبتلا ہے۔ طرح طرح کی افواہیں گشت کررہی ہیں کچھ صحیح کچھ غلط۔ لطف یہ ہے کہ جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہو رہا ہے اس سے نہ عام ہندو کو فائدہ ہے اور نہ مسلمان کو۔

مرزا خلیل بیگ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ دسمبر کا مہینہ یہاں بہت افراتفری میں گزرا، ۷ دسمبر کو یہاں بہت بھیانک فساد ہوا۔ فرقہ پرستوں نے اس بار یونیورسٹی کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور سراسر جھوٹی، غلط اور بے بنیاد خبریں ہندی اخبارات میں شائع کرائی تھیں، جن سے یو۔ پی کے کئی دوسرے شہروں میں بھی اس زمانے میں فساد پھوٹ پڑا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ سب خیریت سے ہیں اور یونیورسٹی میں ہر طرح کا امن و امان ہے، شہر میں کشیدگی ابھی برقرار ہے اس لیے رات کا کرفیو بھی ابھی جاری ہے۔ دعا کیجیے کہ خدا ہم سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ہر جگہ جلد امن وامان قائم ہو جائے۔

شہپر رسول

آپ کا خط مل گیا، یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ جی ہاں، میرا شہر آگ کی لپٹوں اور گولیوں کی بوچھاروں میں گھرا رہا ہے۔ تفصیل کیا بیان کروں، بس یہی کافی ہے کہ میں بخیر ہوں۔

رئیس الدین رئیس

ایک ماہ کے مسلسل کرفیو کے بعد، کل شہر ملا کر کل اور آج دن کا کرفیو ہٹا ہے H.P.O.
جاکر ڈاک کا انبار لایا ہوں۔ تمام شمالی ہند ہی فساد کی زد میں ہے۔ زندگی جینا مشکل ہو رہا ہے۔
اللہ اپنا رحم و کرم فرمائے۔ ہر انسان مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

لکھنؤ
جعفر عسکری

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اکتوبر سے سورشوں کا جو سلسلہ چل رہا ہے وہ اب تک جاری ہے۔ غالباً یوں ہی جاری رہے گا۔ لکھنؤ کسی حد تک پرسکون ہے، لیکن ماحول میں کشیدگی زبردست ہے۔ یکم جنوری کو بعض علاقوں میں چند وارداتوں کے بعد کرفیو لگ گیا تھا، کل سے اٹھا لیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ بڑے ہی پرآشوب دور سے گذر رہے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں پر فسادات کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ عدمِ تحفظ کے احساس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ جان، مال، زبان، تہذیب، وقار اور خود کو آزاد ہندوستان کا آزاد شہری سمجھنے کا احساس، سب بری طرح مجروح ہوئے ہیں: دعا کیجیے کہ حالات پھر سے معتدل ہوں۔

نامی انصاری

آپ کا ۲۲ دسمبر کا خط کل ملا، آپ میری خیریت دریافت کی اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔ فسادات کا یہاں بہت زور رہا، مگر کے فضل سے نہ صرف میں بلکہ اردو سے متعلق تمام احباب اور متعلقین محفوظ و مامون ہیں۔

احمد ابراہیم علوی (اڈیٹر آگ)

خدا کے فضل و کرم سے ہم لوگ بخیریت ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا گذشتہ ۳۰ اکتوبر سے ہم لوگ تہہ تیغ ہیں، روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ سازشوں کا ایک سلسلہ ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتا۔ ایڈوانی نے فضا کو اتنا مسموم کر دیا ہے کہ کسی کو کسی پر اعتبار نہیں رہ گیا ہے۔ فی الحال کوئی امید نہیں ہے کہ حالات خوش گوار ہو سکیں۔

تکمیل بھیونڈی

نیرؔ مسعود۔

خیریت طلبی کا خط عرصہ ہوا مل گیا تھا۔ نہایت ممنون ہوں۔ لکھنؤ کے سے پُرامن شہر کے لیے فساد کی فضا نئی چیز ہے، جس نے ذہنی سکون غارت کر رکھا ہے۔ کرفیو کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ آپ کی احوال پرسی نے بہت متاثر کیا اور سکون بھی پہنچایا۔

بجنور (یو۔ پی)
نشترؔ خانقاہی

آپ نے خیریت پوچھی، میرا حال جاننا چاہا، میں آپ کے اس خلوص سے بے حد متاثر ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ تین ماہ کا عرصہ اس شہر پر قیامت سے کم نہیں تھا۔ میں اور میری فیملی بہت مشکل سے اپنی جان بچا سکے۔ اب حالات نارمل ہیں، لیکن رات کا کرفیو جاری ہے۔ فساد میں بہت بڑی تباہی ہوئی ہے یہاں۔

امروہہ (یو۔ پی)
حفیظ آتش

آپ نے بروقت خیریت دریافت کر کے اپنا اخلاقی اور بھائی چارگی کا فرض ادا کیا ہے اور خط پڑھ کر میں نے تمام دوستوں سے کہا کہ ابھی قدریں زندہ ہیں۔ میں اس کے لیے آپ تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حالات یہاں خدا کے فضل سے تناؤ کی حد تک رہے، کسی طرح کی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ابھی اس سے چھٹکارا ہوا ہی تھا کہ بمبئی میں جوگیشوری اور یو۔ پی میں غازی آباد میں فساد بھڑک اٹھا، اور خلیجی جنگ الگ ایک آفت بنی ہوئی ہے۔ بہر حال خدا حق کو کامیابی دے اور سامراجی قوتوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے۔

شاہ جہاں پور
اخترؔ شاہ جہاں پوری

آپ حضرات کی دعاؤں اور خدا کے فضل سے مع احباب و اعزا بخیریت ہوں۔ یو۔ پی میں صرف شاید شاہ جہاں پور میں کرفیو نہیں لگا۔ حالاں کہ شرپسندوں نے کوششیں تو بہی رہی کہ حالات خراب ہوں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جون پور
اختر سعید انصاری

اس بار ہماری ریاست میں بڑے بھیانک قسم کے فسادات ہوئے۔ پہلی بار ہمارے شہر جون پور میں بھی کرفیو لگا، مگر اب پوری ریاست میں حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کی محبت اور خلوص کا تہہ دل سے شکریہ۔

الہ آباد
سید محفوظ الاسلام

خدا کا شکر ہے کہ الہ آباد میں ابھی تک امن ہے۔ یہاں لوگوں نے اتحاد اور محبت کا ثبوت دیا ہے۔ دعا کریں کہ یہ محبت بنی رہے۔ خلیج کی جنگ نے ساری دنیا کو مضطرب کر دیا ہے۔ دعا ہے کہ دنیا امن و آشتی کے راستے پر گامزن ہو۔ کاش! کہ لوگوں کی سمجھ میں آجاتا کہ امن، ترقی اور خوش حالی زور زبردستی سے نہیں بلکہ محبت اور نیک نیتی پر منحصر کرتی ہے۔

حیدرآباد
محمد رضی الدین معظم

گرامی نامہ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ملا۔ ہمت افزائی کا دلی شکریہ۔ تاریخ حیدرآباد میں پہلی بار خون ریز فسادات ہوئے، جو ہر حیدرآبادی کو متاثر کیے بغیر نہ رکھ سکے۔ بندۂ عاجز بھی چاقو زنی کا شکار ہوا تھا۔ بہ فضلِ ربی آپ جیسے رفیق و شفیق شخصیتوں کی دعاؤں کے باعث صحت یاب ہوں۔

رؤف خیر

میں یہاں الحمدللہ خیریت سے ہوں۔ فسادات کے شعلے میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ سنا ہے بے شمار غنڈہ عناصر حیدرآباد کو بھاگل پور بنانے کے لیے بہار سے حیدرآباد آئے تھے، مگر ان کی لاشیں یہاں مختلف سرکاری دواخانوں میں بے شناخت پڑی رہ گئیں۔ ان پر کوئی رونے والا بھی نہیں۔ مسلمانوں کا اس میں شک نہیں مالی نقصان تو ہوا کچھ جانی بھی ہوا، بہر حال فسادات فرقہ پرستوں کو مہنگے پڑے۔ حیدرآباد الحمدللہ ہمیشہ مہنگا پڑتا ہے۔ آگے اللہ حافظ ہے۔ دراصل نئی نسل زندگی کی اہمیت کیا خاک جانے گی۔ اس کو احساس دلانے کے لیے کوئی بڑا مصلح قوم، کم از کم گاندھی (راجیو گاندھی نہیں) موہن داس کرم چند گاندھی کی طرح پیدا ہونا چاہیے۔

پٹنہ

احمد یوسف

میں نومبر کے فسادات جھیل کر دسمبر کے اوائل میں ذرا ملک کے باہر چلا گیا تھا۔ ۱۴ر مارچ کو پٹنہ واپس پہنچا تو آپ کا ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۰ء کا تحریر کردہ خط ملا۔ بے انتہا شکریہ آپ کا۔ نومبر کے فسادات میں ہم لوگ سخت ترین ذہنی اذیت کا شکار رہے، یوں کہ ہمارے چہار طرف ۔ چپتے تھے اور ہم آنکھوں ہی آنکھوں رات کاٹ دیا کرتے تھے، لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہم لوگوں کو کسی قسم کا کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا۔ مزاج پرسی کے لیے ایک بار پھر شکریہ قبول فرمائیں۔

عالم خورشید

آپ کا خط ملا۔ یاد آوری کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ میں تمام دوستوں کے ساتھ بہ عافیت ہوں مگر کب تک ؟ یہ نہیں کہا جا سکتا۔ پورے ملک کی جو صورتِ حال ہے اس کے پیشِ نظر مصالحت اور پیار کی ساری کوششیں رائیگاں ہوتی نظر آرہی ہیں اور حالات اسی راستے پر لے جانے بضد ہیں جس پر ہمیں چلنا نہیں چاہیے۔ اس مسئلے پر تمام لوگوں کو غور و فکر کرنا چاہیے کہ اب یہاں سکون سے زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ میں آخر میں ایک بار پھر آپ کی محبت کے لیے شکر گذار ہوں۔

اعجاز علی ارشد

آپ نے مصیبت کی گھڑی میں یاد فرمایا اور حوصلہ بڑھایا۔ فسادات سے پرانا شہر متاثر ہوا تھا۔ ہم لوگ اللہ کے فضل اور آپ جیسے مخلصین کی دعاؤں سے محفوظ رہے۔

عبدالواسع

حالات بہت نازک تھے۔ ذہن پریشان تھا، کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی، معاف کیجیے۔ اب حالات قدرے پرسکون ہیں، اور زندگی معمول پر آرہی ہے تو آپ کا خط نکال کر جواب لکھنے بیٹھا۔ دوسرے لوگوں کے بھی خطوط ملے تھے۔ کسی کو جواب بروقت نہ دے سکا: اس کا بہت افسوس ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں جس تیزی سے نفرت کا بیج بویا جا رہا ہے اس کا نتیجہ ہولناک ہوگا۔ وسیع الخیال اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں یقین رکھنے والے لوگوں کو مل بیٹھ کر اس کا توڑ کرنا چاہیے۔ اگر اس راہ میں کسی کام آسکا تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

بھاگل پور (بہار)
ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

آپ کا کرم نامہ ملا۔ حالات ایسے ہیں کہ ہم سولی پر لٹکے ہوئے ہیں۔ خوف اور دہشت کے ماحول میں جی رہے ہیں، یہاں سے وہاں تک جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تفصیل جان کر خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ آخر ہم کب تک بے بس اور مجبور بنے رہیں گے۔؟ ہمارا قتل عام کب تک ہوتا رہے گا؟ ہم کب تک آدھے ادھورے ہوتے رہیں گے؟ ہم نامساعد اور غیر یقینی حالات میں جی رہے ہیں دعا کرتے رہیں۔

ارریا
رفیع حیدر انجم

آپ نے ایک دور افتادہ دوست کی خبر گیری کی، ایسے مخلص دوست اب کہاں؟ آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ بہار کے کئی مقامات فسادات کی زد میں آئے ہیں۔ پٹنہ کی خبریں تو اخباروں کے ذریعے پہنچی ہوں گی۔ ارریا ضلع، نیپال کی سرحد کے قریب ہے اور یہ علاقہ مسلم اکثریت والا ہے، شرپسند عناصر کی نظر بد سے اب تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ دل ہیں اور قومی ہم آہنگی کا جذبہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب تک کوئی ناپسندیدہ واقعہ ظاہر نہیں ہو سکا، حالاں کہ لوگوں کا تھوڑا بہت متاثر ہونا فطری ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اللہ کا کرم ہے۔

آرہ
شاہد کلیم

نیا سال مبارک ہو، آپ نے اپنے خط کے ذریعے مجھے یاد کیا، میں آپ کے اس خلوص اور محبت کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ پچھلے دنوں پورے ملک میں جو زہریلی ہوا پھیلی ہوئی تھی اس کے اثر سے بہار کے فن کار محفوظ ہیں، خدا کا کرم ہے۔ مگر یہ زہریلی ہوا ہمیشہ چلتی ہی رہے گی۔ ہمیں اپنی حفاظت اور بقا کے لیے تدبیر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زہریلی ہوا کا خاتمہ ہو سکے۔



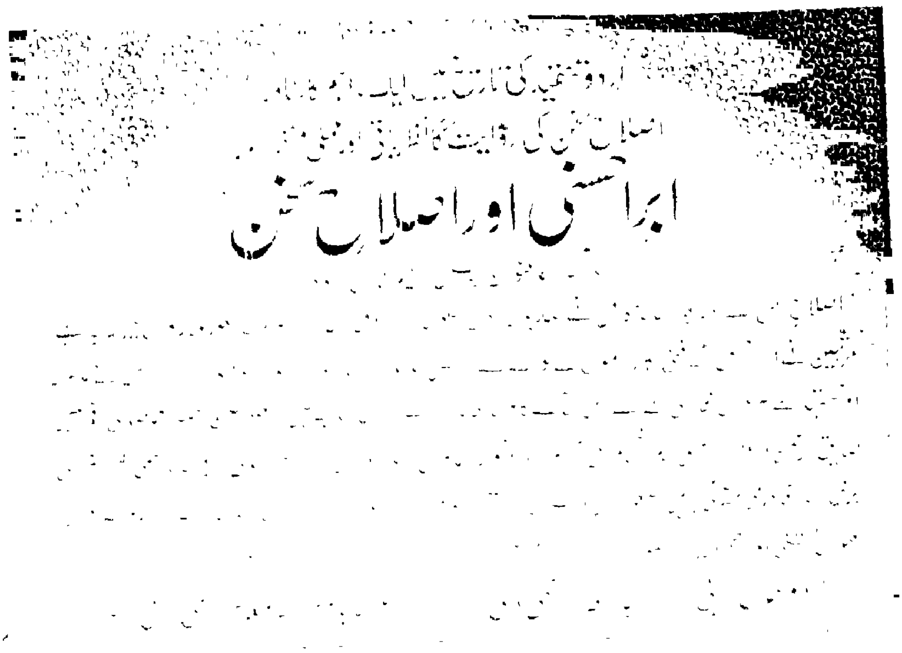
گیا
فردوس گیاوی

۲۰ر دسمبر ۹۰ء کا تحریر کردہ آپ کا محبت و شفقت بھرا خط موصول ہوا۔ اس محبت اور فردوس نوازی کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ ہاں اس طرف فسادات اور کرفیو کا زور تھا لیکن میرے شہر پر اللہ کا خاص کرم رہا۔ ویسے کشیدگی زبردست تھی۔ ابھی صوبہ بہار سے فساد نامی تہوار ٹل چکا ہے کیوں کہ ابھی کھاڑی میں زبردست جنگ جاری ہے اور تمام لوگوں کی نگاہیں ابھی اس طرف مرکوز ہیں۔ ممکن ہے یہ تہوار ہندوستان کے کسی شہر یا قصبہ میں پھر برپا ہو۔ ویسے خدا نہ کریں۔ دعا کریں۔

پالن پور (گجرات)
مشکور احمد قریشی

~ گولی کہیں بھی چلے آئے گی اسی طرف ۔:۔ خوب جانتی ہے ہماری گلی کو وہ

محترم بالکل صحیح بات ہے کہ مسلسل تین ماہ تک ایسے مخدوش حالات درپیش رہے کہ الاماں والحفیظ' متواتر کرفیو میں نظر قید' یک طرفہ گرفتاریاں' تعصب کے مسموم شعلے' قتل و قتال' آتش زنی' اقلیتیں بری طرح متاثر۔ غالباً اسی کا نام جمہوریت اور سیکولرازم ہے اور اس مضحکہ خیز منطق سے زیادہ اور واضح مذاق کا ثبوت ملنا مشکل ہے۔ ●●



ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار

عنوان چشتی

میری نگاہ میں شخص اور شخصیت میں فرق ہے۔ شخص کو شخصیت بننے کا عمل قطرے کے گوہر بننے کا عمل ہے۔ دنیا میں ان گنت اشخاص ہیں مگر شخصیتیں کم ہیں۔ شخص کا دائرۂ فکر و عمل بہت ذاتی اور محدود رہتا ہے۔ اکثر اشخاص متاثر ہوتے ہیں، موثر نہیں بن پاتے۔ شخصیت اپنے دائرۂ فکر و کار کی وسعت، عظمت، افادیت اور اثر انگیزی سے پہچانی جاتی ہے اور اس کا دائرۂ فکر و کار وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ نیز وہ مشکِ نافہ کی طرح اپنے گرد و پیش کو معطر اور متاثر کرتی رہتی ہے۔ شخصیت فعال اور متحرک ہو کر ماحول اور سماج کے مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو اپنے رنگ میں رنگتی ہے۔ ہر شخصیت اپنی کسی غالب خصوصیت اور کارناموں کی بنا پر تہذیب و سماج کے کسی ایک دائرے میں زیادہ سرگرم کار ہوتی ہے اور اسی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً ادب کی نسبت سے ادبی شخصیت، سیاست کی نسبت سے سیاسی شخصیت وغیرہ۔ لیکن بعض شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک دائرے تک محدود نہیں ہوتی اس کی کئی کئی نسبتیں ہوتی ہیں۔ یعنی اس کا دائرۂ اثر و نفوذ سماج اور زندگی کے کسی ایک دائرے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو متاثر کرتی ہے۔ اور سماج کے بہت سے دائروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسی شخصیت میں متعدد خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد یا متصادم نظر آتی ہیں۔ لیکن ایسی شخصیت تضاد میں یک رنگی اور تصادم میں ہم آہنگی پیدا کر کے سماج اور زندگی کے متعدد مرغزاروں میں اپنے فکر و کار کے پھول کھلاتی ہے۔ اور غیر معمولی ہمہ جہت "شخصیت" کہلاتی ہے۔

[illegible] (اردو) بی ۱۷۱، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ــــ ۲۵

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی ہی غیر معمولی اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جس نے ادب، تہذیب، مذہب، سیاست اور سماج کے مختلف میدانوں میں اپنے تخلیقی جوہر بصیرت اور موزوں طرز کار سے سماج اور زندگی کے دامن پر اہم اور اثر انگیز دیرپا اور دور رس نقوش بنائے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے آثار ابوالکلام آزاد میں مولانا آزاد کی تحریر و نفسیاتی مطالعہ پیش کر کے ان کی شخصیت کی ایک دل آویز تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ خود قاضی عبدالغفار کو بھی تھا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

> "کتنا مشکل کام ہے۔ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس اندیشے کو دل سے نکالنا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں" (آثار ابوالکلام آزاد ص ۳)

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایک کتاب کسی دوسری کتاب کا بالکل نعم البدل نہیں ہو سکتی، اسی طرح ایک شخص دوسرے شخص کا سو فی صدی مثیل نہیں ہو سکتا۔ ناظر منظر کی شاہد مشہود کی، ناقد تخلیق کار کی شخصیت کا سو فی صدی سچا ادراک نہیں کر سکتا دونوں کی الگ الگ حیثیت ہوتی ہے۔ نقاد اپنی شخصیت کے حدود اور امکانات میں فن کار کی شخصیت کا ادراک کرتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ نقاد اپنی شخصیت کے آئینے میں ایک خاص انداز سے تخلیق کار کی شخصیت کا جلوہ دیکھتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا جو نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہے۔

قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کو ایک مشکل شخص (Difficult Personality) قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔

"مولانا ایک بہت مشکل انسان ہیں" مشکل اس اعتبار

ہے کہ اُن کی شخصیت اپنی ایک خصوص
مرکزیت میں خلوت نشیں رہتی ہے اور
عوام کی نظر کا مرکز بنا گوارا نہیں کرتی
مشکل اس لئے ہے کہ ان کی "انفرادیت"
عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند
ہے کہ کوئی عامی کسی عام پیمانے سے
اُسے ناپ تول نہیں سکتا۔ جس طرح
غلہ تولنے کی ترازو میں ہم موتی نہیں
تول سکتے۔ اسی طرح مولانا کی نفسیات
کے لئے بھی کسی "عام پیمانے" کے بجائے
ایک "مخصوص پیمانے" مقیاس اور ایک
طاقتور خوردبین کی ضرورت ہے"
(آثار ابوالکلام آزاد ص ۱۷۶)

قاضی عبدالغفار نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو اپنی "مخصوص مرکزیت میں خلوت نشیں" قرار دے کر اُس کو ناقابلِ فہم قرار دیا ہے۔ اور اُس کو ناپنے یا سمجھنے کے لئے کسی مخصوص پیمانے کی ضرورت پر اصرار کیا ہے۔ ایک اور جگہ انھوں نے مولانا آزاد کی شخصیت کو "گنبد بے در" قرار دیا ہے۔

"مولانا کو دور سے دیکھ کر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ گویا انھوں نے ایک گنبد کے
اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور
اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے) اپنے وجود
معنوی کو بند کر رکھا ہے"۔ (آثار ابوالکلام آزاد ص ۱۸۰)

قاضی عبدالغفار نے ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو ایک گنبد بے در کہا ہے اور ایسی شخصیت قرار دیا ہے جو اپنی ذات کے صنم کدے میں خلوت نشیں ہے۔ اور دوسری طرف انھوں نے اربابِ فکر و دانش کی نارسائی اور عوام و خواص کی عدم دسترس کی طرف بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

> "عوام کی زندگی میں مولانا کی زندگی کا تصور کچھ ایسا ہے کہ گویا اُن کے افکار کا ایک اونچا مینار ہے۔ اور مینار پر ایک بند حجرہ ہے۔ اور اُس حجرے میں مولانا کی معنوی شخصیت "خلوت نشیں" ہے اور اُس خلوت کے پردوں کو ہاتھ لگانا ایک عامی تو کیا خواص کے لئے مشکل ہے"۔ (آثارِ ابوالکلام آزاد ص ۱۷۷)

اِن تحریروں سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا دیومالائی تصور پیش کیا ہے۔ اور اس دیومالائی تصوّر کو پیش کرنے میں یہ جذبہ زیریں لہر بن کر کام کر رہا ہے کہ صرف وہی مولانا کی مشکل شخصیت کو آسان بنا رہے ہیں۔ اور اُن کے "گنبدِ بے در" میں جھانک کر کچھ خاص لمحے چرا رہے ہیں اور اُنہیں لفظ و معنی کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ اور صرف وہی "اونچے مینار" کے بند حجرے کی خلوت نشیں شخصیت کے پردوں کو ہاتھ لگا کر اُن کی پُراسرار جنبشوں کو اپنے نفسیاتی مطالعے میں پیش کر رہے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے آثارِ ابوالکلام آزاد میں یہ تو لکھ دیا کہ یہ آزاد کی شخصیت کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ مگر اُنھوں نے یہ واضح نہیں کیا کہ اُنھوں نے نفسیات کے کس نظریے سے آزاد کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی ذات و صفات، شخصیت اور فن کو نہ تو فرائڈ کے نظریۂ تحلیلِ نفسی" کی روشنی میں پرکھا ہے۔ اور نہ ہی یُنگ کے "اجتماعی لاشعور" کے

نظریے کی چاندنی میں دیکھا ہے۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ انہوں نے ابوالکلام آزاد کے نفسیاتی مطالعہ میں کسی بھی نفسیاتی نظریے کو بنیاد نہیں بنایا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا خیال ہے

(۱) غبارِ خاطر اور مولانا کی بعض تحریروں کو اگر ایک پیمانہ بنا لیں تو اُس سے مولانا کی واردات قلب کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔" (ص ۱۸۱)

(۲) مولانا کی نفسیات کو اُن کی تحریر کے پردوں میں تلاش کیا جائے۔ تاکہ اُسی پس منظر میں مولانا کے فرمودات اور ادبی اسلوب بیان کا تجزیہ کیا جا سکے۔" (ص ۱۸۱)

قاضی عبدالغفار نے تذکرۂ غبارِ خاطر، الہلال اور ابوالکلام آزاد کی دوسری تحریروں کا تجزیہ کر کے آزاد کی شخصیت کے نہاں خانے میں جھانکنے کی جو کوشش کی ہے۔ اُس کے پس پشت کوئی اصول کار فرما نہیں ہے۔ اُصول سے میری مراد یہ ہے کہ انہوں نے ابوالکلام آزاد کی تحریروں کو نفسیات کے کسی مسلّمہ اصول اور قاعدے کے تحت نہیں پرکھا ہے۔ اس لیے اپنی تمام تر دیدہ ریزی اور نکتہ سنجی کے باوجود وہ کسی مخصوص نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں۔ بلکہ پریشاں فکری اور ریزہ خیالی کا شکار ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے آزاد کی تحریروں سے اُن کے اسلوب میں تکرار سے وارد ہونے والے بعض افکار کو بنیاد بنا کر یا آزاد کے طرزِ فکر کے غالب رجحان کو اساس قرار دے کر جو نتائج نکالے ہیں وہ عام مطالعہ کا نتیجہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی مطالعہ کا حاصل تصوّر نہیں کیے جا سکتے

قاضی عبدالغفار نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کی خصوصیات کا تعین کرتے ہوئے کہا ہے کہ آزاد کی تحریروں میں انانیت، انفرادیت، خلوت پسندی اور کم آمیزی، خود پسندی، خود اعتمادی، تنہا گزینی، مایوسی اور ضد، بُردباری اور تحمل، عزم و استقلال، بے نیازی و قلندری، مذہبیت اور انسان دوستی وغیرہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ یہ خصوصیات اُن کی تحریروں کے ساتھ آزاد کے مزاج کا حصہ بھی تھیں تو بھی نفسیاتی مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ نفسیاتی مطالعہ فن کار کی شخصیت کے نہاں خانوں میں جھانک کر اُن اسباب و محرکات کی نشاندہی کرتا ہے، جنھوں نے اُس کی تعمیر میں حصہ

لیا،

لیا ہے۔ یہ محرکات سیاسی، سماجی اور تہذیبی نہیں ہوتے بلکہ خالص نفسیاتی اور داخلی ہوتے ہیں۔ نفسیاتی مطالعہ فن پارے کے اسلوب اور اقدار پر محاکمہ بھی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی مٹھی میں چھپے ہوئے جگنوؤں کی تلاش کرتا ہے یعنی نفسیاتی اثرات کی چھان بین کرتا ہے اس ساتھ ہی فن کار کے تخلیقی عمل کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کی تشکیل کرنے والے نفسیاتی اسباب و محرکات پر روشنی نہیں ڈالی۔ آزاد کی تحریروں کے بطن کو تراش کر اُس مشک نافے تک رسائی حاصل نہیں کی، جس کو داخلیت یا نفسیات کا گہوارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے آزاد کے تخلیقی عمل یعنی ادب اور فن کے ارتقا کی جذباتی اور تخیلی پہلو کا تجزیہ بھی نہیں کیا ہے۔ انھوں نے آزاد کی تحریروں کے کلیدی استعاروں، پیکروں اور علامتوں کو آزاد کے لاشعور اور اجتماعی لاشعور کا خارجی اظہار تصوّر کر کے اُن کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہیں کیا ہے اور آزاد کے تخلیقی پیچ وخم کی نشاندہی بھی نہیں کی ہے اس لئے یہ عمومی مطالعہ تو کہا جاسکتا ہے نفسیاتی مطالعہ نہیں۔ قاضی عبدالغفار نے ابتدا میں صحیح لکھا تھا کہ آزاد کی شخصیت ایک متنوع اور پہلو دار شخصیت ہے۔ مگر آزاد کی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں انہوں نے عمومی نفسیاتی رویّے سے کام لیا ہے جس کی وجہ سے قاضی عبدالغفار کی بنائی ہوئی تصویر دل کش ہوتے ہوئے بھی ابوالکلام آزاد کی سچی تصویر نہیں ہے قاضی عبدالغفار کی قلمی تصویر کو میں نے دل کش محض اس خیال سے کہا ہے کہ قاضی صاحب نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو دیومالائی بنا کر اور آزاد کی تحریروں سے سجا کر اپنے بے ساختہ سلیس اور تازہ کار اسلوب میں پیش کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلو دار شخصیت کے بارے میں خود ہی ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

"انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں
بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر
دینی پڑیں۔ ایک قید خانے کے باہر کی۔ ایک قید
خانے کے اندر کی۔ قید کے باہر کی زندگی میں اپنی

طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور
خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی
فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا۔ اور دل اپنی
نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اور
بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا۔ لیکن یارِ
خاطر نہیں ہوتا۔ لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں" (غبارِ خاطر ص)

ایک عام غلط فہمی ابوالکلام آزاد کے فن اور شخصیت پر کام کرنے والوں کو یہ ہے کہ آزاد نے اپنے خاندانی ماحول کے اثرات سے کلیتاً دامن چھڑا لیا تھا۔ قاضی عبدالغفار بھی اس مغالطے کا شکار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض بنیاد پرست عالم نے ابوالکلام آزاد کو اپنی تصوّف دشمن قطار میں کھڑا کرنے کے لیے انھیں اپنی طرح کا قدامت پسند اور بنیاد پرست عالم بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس روّیے سے بھی بعض غلط فہمیوں کو راہ ملی ہے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک صوفی گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ اپنے گھر میں تصوّف کی علمی، عملی اور کشفی تصویر دیکھی تھی۔ مولانا آزاد نے بھی خود اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ تصوّف کے نام پر پیری مریدی کی ظاہری رسوم و روایات کو پسند نہیں کرتے لیکن انھوں نے تصوّف کی روح اور اُس کے معنوی پہلو کی کہیں تردید نہیں کی ہے یعنی ابوالکلام آزاد نے تصوّف کو کلیتاً مسترد نہیں کیا ہے۔ اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آزاد کی تحریروں میں تصوّف کے نظریوں اور اسرار و رموز کی جلوہ گری ہے اُن کی تحریروں میں صوفیانہ اندازِ فکر و نظر نیز متصوّفانہ روّیہ پوری طرح کارفرما ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب آزاد دربارِ علماءِ علمائے سُو یا محض علماء کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُن کے قلم میں تردید، تکذیب اور حقارت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جب اللہ والوں اور صوفیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا قلم رہبر بڑھتا ہے، رقص کرتا ہے اور صوفیا کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ اس معیار پر اگر تذکرے اور غبارِ خاطر کو ہی پرکھ لیا جائے تو اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ابوالکلام آزاد نے تکیہ...

جہاں بھی اورنگ زیب کا ذکر کیا ہے وہاں اُس کے نقطۂ نظر مقصد اور طرزِ فکر و کار کی تردید اور تغلیط کی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں دارا شکوہ اور سرمد شہید کے انداز فکر اور رویّے کی تائید کی ہے۔ اور ان دونوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ آزاد نے اپنے خاندان کے ماحول سے قطعاً بغاوت کی تھی۔ یا وہ تصوّف کی محفل سے اُٹھ کر بنیاد پرستی کے آغوش میں جا بیٹھے تھے۔ انھوں نے خانقاہ کی بعض مروّجہ رسموں اور پیری مریدی کے خارجی معاملوں کو ضرور مسترد کیا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور تحریروں میں تصوّف کی روح جلوہ گر رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوّف کی بنیادی فکر اور رویّہ اُن کی شخصیت اور اسلوب کو دل نشیں اور معنی آفریں بناتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو پوری طرح نہ سمجھنے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ ایک تو ناقد مولانا آزاد کی شخصیت کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر، ذہنی وفاداری اور رویّے کے تحت پیش کرنے کی سعئ نامشکور کرتے ہیں، جس سے ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے پردے نہیں اُٹھتے بلکہ اُس پر مزید پردے پڑ جاتے ہیں۔ جو پڑھنے والوں کے ذہن و فکر تک پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ہر بڑی شخصیت کی طرح ابوالکلام آزاد کی ہمہ جہت اور رنگا رنگ شخصیت کے سارے گوشوں اور جلوؤں تک رسائی حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ بقول شخصے وہیں تک دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ خود آزاد نے اپنے بارے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے سحر انگیز اسلوب میں اتنے بیانات صادر کئے ہیں کہ عام پڑھنے والے کے حواس متاثر ہو جاتے ہیں اور وہ ذہنی مرعوبیت، تضاد یا تناقض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک عام قاری کبھی اپنی علمی کم مائیگی کے سبب، کبھی آزاد کی بلند قامتی کی بدولت اور کبھی آزاد کے خطیبانہ یا جاہ و جلال کے سامنے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے قاضی عبدالغفار اپنے دل کش اور جمال آفریں اسلوب، تخلیقی جوہر اور تجزیاتی صلاحیت کے باوجود ابوالکلام آزاد سے بے حد مرعوب نظر آتے ہیں۔ اُن کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ انہوں نے کسی نفسیاتی نظریے کو بنیاد بنائے بغیر فری لانسنگ کے انداز میں

بقیہ صـ ۱۹۲ پر

قرۃ العین حیدر کا سماجی شعور

ڈاکٹر سید نعیم الدین

"آخر شب کے ہم سفر" اور گردشِ رنگِ چمن" کی روشنی میں"

معاشرہ طرح طرح کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو طرح طرح سے سوچتے ہیں۔ کبھی ان کے سوچنے کے انداز آپس میں متصادم ہوتے ہیں تو کبھی کبھی متوافق۔ کبھی وہ جو سوچتے ہیں وہی کہتے ہیں کبھی وہ سوچتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے تو فکر و نظر میں تبدیلی آجاتی ہے۔ قرۃ العین جیسے ذہین ادیبوں کی افراد کے ہر انداز فکر اور سماج کی ہر تبدیلی پر نظر ہوتی ہے۔ موصوفہ کے صرف دو ناولوں "آخر شب کے ہم سفر" اور گردش رنگ چمن" ہی کو پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلی صدی کے ساتھ ساتھ اس صدی کے ہندستانی سماج پر ان کی نظر کس قدر گہری ہے۔ "آخر شب کے ہم سفر" آزادی کے بعد بنگال کے مشرقی پاکستان بننے اور پھر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی سیاسی کہانی ہے۔ اس میں بالعموم اہل بنگال کے بدلتے ہوئے سماجی رجحانات کی بات کی گئی ہے۔ اسی طرح مابعد غدر کے برطانوی حکمرانوں کے مظالم اور سماجی اتھل پتھل کی داستان "گردش رنگ چمن" میں بیان کی گئی ہے۔ دونوں میں سیاسی اور سماجی حالات کو عمدہ اور فن کارانہ رنگ دیا گیا ہے۔

دونوں کی دنیا جیتے جاگتے کرداروں سے معمور ہے۔ "آخر شب" ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۹ء کے درمیان لکھی گئی، اس کے دیپالی اور روزی جیسے خاتون کردار بیسویں صدی کے اس دور سے متعلق ہیں جب دوسری بڑی لڑائی کے بعد پرانا معاشرہ دم توڑ رہا تھا۔ اس زمانے میں جب روزی صبح کی گئی رات دیر سے آتی ہے تو اس کے والد پادری بنرجی اس سے باز پرس نہیں کرتے (ص ۱۷۱) لیکن اس سے پہلے کے زمانے کی بات کچھ اور تھی۔ سماجی پابندیوں کا سب سے زیادہ اثر صنف نازک ہی پر پڑتا تھا۔ "گردش رنگ چمن" میں غدر کے بعد انگریزوں کے کشتۂ ستم ایک خاندان کی لڑکیاں (دول نواز اور مہرو)

"ایمن" سرکٹ ہاؤس روڈ، امراوتی کیمپ، امراوتی ۲-۶۰۲ ۴۴۴ (ایم۔ایس)

مطربہ کا پیشہ اختیار کرلیتی ہیں۔ مہرو کی بیٹی شمو اس طرزِ حیات سے مانوس ہو جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے اس قدر خوش ہے کہ عام گرہستنوں پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتی ہے کہ بھلا ان کی بھی کیا زندگی ہے' ساری عمر لونڈیوں کی طرح پکاتی ہیں' بچے پالتی ہیں' میاں کی جوتیاں سیدھی کرتی ہیں پھر بھی طلاق کی تلوار ان پر لٹکتی رہتی ہے۔ یہ گھروالی عورتیں ہی تو ہیں جو بات بات پر کہتی ہیں "اے ہم عورت ذات کیا جانیں"۔

دل نواز کی طرح گل رخ بانو بھی باپ کے مرنے پر بے سہارا زندگی گذارتے ہوئے رقص و سرود کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بچپن ہی میں استحصال کا نشانہ بنتی ہے' مصیبتیں سہتی ہے' ایک عرصے تک اپنے آپ کو انسان سے کم درجے کی مخلوق سمجھتی ہے' لیکن پھر اس کا شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ یہ طے کرتی ہے کہ وہ آزادانہ زندگی گذارے گی۔ اس کی بیٹی عندلیب اپنی ماں کی توہین زندگی سے بغاوت کرتی ہے اور زندگی میں ایک سماجی رتبہ حاصل کرنا چاہتی ہے' چناں چہ وہ ایک پنج وقتہ نمازی سید شکور سے شادی کرلیتی ہے' اس کے ہاں خوشی خوشی برتن مانجھتی ہے' چولھا پھونکتی ہے لیکن سید شکور کسی طرح دل سے یہ خیال نہ نکال سکے کہ اصلاً یہ ایک بازاری عورت ہے' چناں چہ وہ ایک برقعہ پوش خاندانی لڑکی سے شادی رچالیتے ہیں جو عندلیب کو ناکوں چنے چبواتی ہے۔ اس سلسلے میں عندلیب کی بیٹی عنبر اپنے ساتھی ڈاکٹر منصور سے کہتی ہے۔

"منصور! بہت سے سماجی رویے اب تک کہاں بدلے ہیں"

عنبر خود ایم بی بی ایس ہے لیکن نگار خانم کا بھائی اس سے اس لیے شادی نہیں کرپاتا کہ وہ بہرحال عندلیب کی بیٹی ہے جو اصلاً سماجی طور پر ایک غیر معتبر خاندان سے متعلق ہے۔ عنبر اپنے حسب نسب کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہے اور بیمار پڑجاتی ہے' خودکشی کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی ماں سمجھاتی ہے کہ خودکشی تمہارے دشمن کریں' تمہاری نانی کی جائیداد مرزا سبط احمد نے ہڑپ کرلی تھی اور ایک دوسرے شخص عبدالباسط کے حوالے کردیا تھا۔ اس کی لاچاری اور بے کسی نے اسے ایک غیر روایتی راہ پر ڈال دیا اور بالاخانہ بسانے پر مجبور ہو گئی تو اس حالت میں گنہ گار کون ہے گل رخ بانو یا مرزا سبط احمد اور عبدالباسط جیسے خود غرض لوگ۔ مفہوم واضح ہے کہ فرد کی برائی کا ذمہ دار اکثر معاشرہ ہوتا ہے۔ چناں چہ عندلیب' منصور کو نہایت طنزیہ لہجے میں "مولانا منصور احمد بخاری" کہہ کر

مخاطب کرتی ہے اور پوچھتی ہے کہ مسلم معاشرہ اس قدر بے رحم کیوں ہے۔ مسلم معاشرہ بے رحم بھی ہے اور دیگر معاشروں کی طرح زندگی کی اعلیٰ اقدار کی طرف بے حس ضرور ہے۔ وہ آج بھی شادی کے موقعے پر غریب امیر کی تفریق کرتا ہے۔ "آخرِ شب" کی جہاں آرا کی مثال ملاحظہ ہو۔ وہ ایک پردہ نشین رئیس زادی ہے، اس کی ماں بیگم قمرالزماں کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا ہے کہ اپنے ہم مرتبہ رؤسا کے لڑکے جاہل اور نکمّے ہیں، اگر متوسط طبقے میں شادی کر دیں تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ غرض بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے جہاں آرا کی شادی ہو پاتی ہے۔ مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ جب جہاں آرا کے بیٹے کی شادی کا موقع آتا ہے تو وہ اپنی بھانجی نامرہ کو اس لیے ردّ کر دیتی ہے کہ وہ کلاس ٹو کے آفیسر کی لڑکی ہے، وہ یہ نہیں دیکھتی کہ لڑکا اسے چاہتا ہے، وہ اس کے لیے ایک کروڑپتی کی لڑکی پسند کرتی ہے۔ دولت و امارت کے دام میں انسان آسانی سے گرفتار ہو جاتا ہے۔

"گردشِ رنگِ چمن" کی نگار خانم، اور شہوار خانم اپنی نمائش پسندی، جاہ پرستی اور امارت پسندی کے ہاتھوں ذلت بھی اٹھاتی ہیں۔ وہ اصلاً متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب جھانسی سے لکھنؤ آتی ہیں تو انھیں یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں داخلے کی ہوس ہوتی ہے۔ چناں چہ معززین کی صف میں آنے کے لیے عالی نسبی کا ڈھونگ رچاتی ہیں، اور خود کو جاگیردار ظاہر کرتی ہیں۔ ایک دفعہ کسی رئیس کا نام سن لیا تو اسی کو اپنا رشتہ دار بنا دیا۔ یہ رئیس غضب کا چالو آدمی تھا۔ اسے ان بہنوں کی رشتہ تراشی کا پتہ چلا تو اس نے ایسی چال چلی کہ ان کے ہوش گم ہو گئے۔ اس رئیس کا نام دلشاد ہے، اس کی باتوں کو اور کارستانیوں کو پڑھ کر دل زیادہ خوش ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی عیاری میں اس کی بے ریائی نے ایک عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ دنیادار ہے لیکن وہ انہیں اعتماد میں لے کر انہیں اپنا ہم راز اور دم ساز بنا لیتا ہے۔ وہ گرگِ باراں دیدہ ہے۔ انگلستان اور امریکا میں اپنا دام پھیلائے ہوئے ہے اور انٹرپول اس کا تعاقب کر رہا ہے، لیکن ان جاہ پرست بہنوں کا پول کھولنے کے لیے وہ اپنے پرانے وطن ہندوستان چلا آتا ہے، یہاں ان بہنوں کی مکّاری کو بے نقاب کرنے کے بعد وہ اپنے دوست سینڈی کے کہنے پر ایک بزرگ کی خانقاہ پر حاضری دینے چلا جاتا ہے۔ یہ بزرگ جدید زمانے کے جدید ولی ہیں، سوٹ بوٹ میں ملبوس اور کلین شیو۔ ہندو مسلمان سب ان کے حسنِ اخلاق سے مرعوب اور متاثر ہیں۔ آج کی پراگندہ، پُرآشوب بحرِ زندگی میں ان کی ذات سکون و آسودگی کا سحر آمیز جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔ (بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر)

انور ظہیر

ترقی پسند افسانہ جب عینیت پسندی (Idealism)، فارمولا بازی، صحافت، خطابت اور بیجا طوالت، وقتی جوش، جلال اور ابال، آرائش زبان و بیان کا شکار ہوا تو اس کے بین بین، اسی سے مختلف نئے افسانے کی کونپلیں پھوٹیں۔ گویا جدید افسانہ ترقی پسند افسانے کے ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اس پودے کو جس نسل نے ہوا مٹی، کھاد پانی مہیا کیا وہ آج تقریباً سنِ رشد کو پہنچ چکی ہے مگر ابھی اس کے بدن میں توانائی ہے اور قلم میں روشنائی بھی۔ اس نسل سے نئی پیڑھی نے اپنے فن کا چراغ روشن کیا تخلیق کی آگ سے اپنے سینے کو پر چایا۔ قلم میں آگ اور پھول بھر دیئے تاکہ موئے قلم محض انگارے نہ اگلے اور نہ ہی نوکِ قلم سے محض پھول برسیں۔ بلکہ دونوں کے خوشگوار امتزاج سے کورے کاغذ پر وہ لفظ ٹپکیں کہ جو نہ زہر ہلاہل ہوں اور نہ ہی قندِ مکرر۔ ان کا ذائقہ ایسا ہو کہ جو حلق سے اُتارا جا سکے۔ بات بھی بن جائے اور مخاطب کا دل بھی دکھے نا۔ یہ خوشگوار اور قابلِ قدر فریضہ ۱۹۷۰ء کے بعد کی کھیپ نے انجام دیا۔ آٹھویں دہے میں سرحد کے اس پار اور اُس پار جو افسانہ نگار نمو اور نمو دپاتے ہیں ان میں شوکت حیات، شفق، اکرام باگ، حسین الحق، سلام بن رزاق، انور خان، ساجد رشید، علی امام نقوی، قمر عباس ندیم، علی حیدر ملک، حسن محمد خاں، سائرہ ہاشمی، مشتاق قمر وغیرہ کے ساتھ انور قمر کا نام بھی بطورِ خاص لیا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے گوتم بدھ جب گیان دھیان میں بیٹھے تو انہیں برگد کی چھتر چھایہ میں نروان حاصل ہوا۔ انور قمر جب پیڈ اور پین لے کر بیٹھے تو انھیں ۱۹۷۱ء میں

لیکچرار اردو ڈپارٹمنٹ، مہاراشٹر کالج آف آرٹس، سائنس اور اکنومک، اے/۲۴۶، بلاسس روڈ، بمبئی ۸
تکمیل بھیونڈی

افسانے کی شکل میں "نئی زادن" ملا۔ یہ انور قمر کا پہلا افسانہ تھا جو گوپال متل کے رسالے "تحریک" دہلی میں چھپا۔ یہیں سے انھیں مزید لکھنے کی تحریک ملی۔ مختلف جرائد و رسائل شائع ہونے کا لگاؤ اور رحجان پیدا ہوا۔ مختلف اوقات میں متعدد افسانے سپرد قلم کیے جنھیں وہ ۱۹۷۹ء میں کتابی شکل میں "چاندنی کے سپرد" کے عنوان سے چھاپہ خانے سے گزار کر منظر عام پر لے آئے۔ یہ انور قمر کے فنی سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ "چاندنی کے سپرد" دراصل ایک افسانے کا عنوان تھا جو ان کی کتاب کا ٹائٹل بنا۔ یہ افسانہ جریدہ "اظہار" بمبئی میں شائع ہوا۔ اس افسانے پر یار دوستوں اور ادبی نشستوں میں کافی لے دے ہوئی۔ یہ افسانہ ایمرجنسی پیریڈ کی دین ہے۔ ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد ایک جلسے میں جب اس بحرانی دور کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا تو وہاں "چاندنی کے سپرد" کا بھی تذکرہ ہوا تھا۔ اس طرح اس افسانے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ زیر بحث افسانوی مجموعے کے دو ایسے افسانوں کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جن پر غور و فکر اور گفتگو کے مرحلے طے ہوتے۔ ایک "ہاتھیوں کی قطار" جس میں شہری زندگی خصوصاً بمبئی کی زندگی، بمبئی کے ہاتھ پیر پسارنے اور عمودی سمت میں بڑھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسمیں بلڈروں کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ اور پارسی کردار بہرام جی کے ذریعے پارسیوں کی زبان اور ان کے باتونی ہونے کی عادت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرا افسانہ "چوراہے پر ننگا آدمی" ہے۔ یہ علامتی افسانوں کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ افسانہ آج کے دور کے تعلیم یافتہ، مہذب، متمدن اور باشعور انسان کی لاسمیت کو آشکار کرتا ہے۔

انور قمر کا دوسرا افسانوی مجموعہ "چوپال میں سنا ہوا قصہ" ۱۹۸۶ء میں طبع ہو کر اہل ادب کے ہاتھوں میں آیا۔ اس مجموعہ کا سب سے کامیاب اور اختلافی افسانہ "کابلی والا کی واپسی" ہے یہ افسانہ ٹیگور کی کہانی "کابلی والا" سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ اس میں انور قمر نے ٹیگور کی متھ (Myth) سے ایک نئ متھ (New Myth) کی تخلیق کی۔ اس افسانے کے تعلق سے انور قمر پر چربے کا

الزام بھی عائد کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ
یہاں سے انور قمر کے افسانے کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ دو توں افسانے دو مختلف شخصیتوں اور دو مختلف اقدار کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اس میں انور قمر نے اپنے طنز کی نال دنیا کی Super Power یعنی امریکہ اور روس کی ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں دخل اندازی اور توسیع پسندی کے ساتھ ہی ملکی انتظامیہ پر بیک وقت رکھی ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔ گو کہ یہ کہانی بین الاقوامی مسائل و موضوعات کا احاطہ کرتی ہے مگر اس میں ایک طرح کا گھریلو پن بھی ہے یہ کہانی نازک خونی رشتوں، خوشگوار ناخوشگوار یادوں قومی اور عالمی تعلقات، رنجشوں، آویزشوں اور تعصبات کے کریہہ اور گھناؤنے پہلوؤں کو اپنے میدان و مدار میں سمیٹ کر ایک وسیع رینج کی کہانی بن جاتی ہے۔ مذکورہ کہانی کے ہندی اور انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں، گلزار نے اسے ٹی وی سیریل کے لیے بھی فلمایا ہے۔

اس مجموعے کا ایک اور اثر آفرین افسانہ "چاند پر بھی سایہ ہے" یہ خالص رومانی کہانی ہے۔ مگر اس کے مرکزی کردار فلومینا کے باطن میں اتر کر اس کی نفسیات کو افسانہ نگار نے فوکس کیا ہے فلومینا حسین ہے مگر بیوگی کا کرب جھیل رہی ہے۔ اس کی پرورش پرداخت مذہبی اور دقیانوسی ماحول میں ہوئی تھی لہٰذا وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی ہے کہ ندامت اور ملامت کا منہ دیکھنا پڑے۔ وہ کبھی جذبات کی رو میں بہتی نہیں تھی اگر کبھی ایسے مواقع آئے بھی تو اسکے جھولے میں ایک سانپ رہتا ہے جو پھنکار کر اسے خوفزدہ یا متنبہ کر دیتا تھا اس طرح وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل یا لذتِ گناہ کے لیے ترستی رہتی ہے۔ یہاں سانپ دراصل علامت ہے خزانے یا دراثت کے محافظ کی گویا سانپ فلومینا کو گناہ سے باز رکھ کے اس کے حسن کی نگہبانی کرتا ہے۔ یہ کہانی اپنے میں بھرپور ہے دیر اور دور تک ہمارے حافظے اور ذائقے کا ساتھ دیتی ہے۔

"کلر بلائنڈ" یہ انور قمر کی تیسری افسانوی کتاب ہے۔ جس میں کل ۱۰ افسانے

ہیں۔ اس کا پہلا افسانہ "کلر بلائنڈ" ہے یہ افسانہ بیک وقت نفسیاتی بھی ہے اور سماجی بھی۔ اس کے کردار اپنی بے بضاعتی کا شکار ہیں سب قسمت کے مارے ہوئے حالات کے قیدی ہیں مسائل اور مصائب سے جوجھتے ہوئے۔ رنگوں کا مفہوم ہوتا ہے جیسے زندگی کا ایک مقصد اور منزل رنگ ہلکے بھی ہوتے ہیں اور گہرے بھی سرخ بھی ہوتے ہیں اور سیاہ بھی سرمئی بھی ہوتے ہیں اور چمپئی بھی۔ انسان عمر بھر ان رنگوں کو پکڑنے ان سے دامنِ نگاہ اور دامنِ دل کو بھر لینے کی سعیٔ مسلسل میں لگا رہتا ہے یہ افسانہ زندگی کی لاحاصلی اور بے معنویت کو پیش کرتا ہے۔ جن کے پاس وسائل ہیں۔ رنگوں کا خزانہ ہے۔ ان کی زندگی بے مصرف اور بے مزہ ہے۔ وہ رنگوں کو دیکھ کر اور رنگوں سے کھیل نہیں سکتے اور وہ لوگ جو رنگوں کے تمنائی ہیں۔ لمحہ لمحہ سے رنگ نچوڑ کر اپنی زندگی کو colourful بنانا چاہتے ہیں۔ تہی دستی، تشنہ لبی اور رنگوں سے دوری ان کا مقدر ہے ان کے پاس صرف خوش رنگ قلم، خوش رنگ پنسلیں، خوش رنگ بٹن، خوش رنگ چوڑیاں، خوش رنگ دستیاں خوش رنگ اسٹیمپ، خوش رنگ پوسٹ کارڈ اور پرندوں کے خوش رنگ پر ہیں[1]۔ مگر رنگوں کی پریاں زندگی کی رونقیں، رعنائیاں اور مسرتیں میسر نہیں۔

اس مجموعہ کا دوسرا ناقابلِ فراموش افسانہ "ان کی کمپیر" ہے اس میں انور قمر نے یہ بتایا ہے کہ انسان آسمانی آفات اور زمینی بلاؤں سے گھبرا کر ہجرت پر مجبور ہوتا ہے۔ آج کے سائنسی تعلیمی اور ترقی یافتہ دور میں بھی انسان کو غم و آلام سے چھٹکارہ نہیں۔ راہِ فرار ڈھونڈتا ہے جو مسدود ہے، راہِ نجات کا متلاشی ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں، جائے امان کی دعائیں بھی کرتا ہے جو عنقا ہے ساری پناہ گاہیں نظروں سے اوجھل ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی پناہ گاہ نظر آتی ہے تو وہ سرابِ خاک ہے موجِ معتبر نہیں سکون کا سائبان نہ شہروں میں ہے نہ قریوں میں خطرات اور خدشات کی تلوار ہر جگہ لٹک رہی ہے۔ کب کس کی گردن تلوار تلے آجائے کوئی نہیں جانتا سانس کی دھونکنی چل رہی ہے پیاس اور آس کا سفر جاری ہے جس کا

[1] کلر بلائنڈ صفحہ ۱۱

کوئی انت نہیں ایسے حالات و حوادث میں انسان جہاں اور جس حال میں ہے۔ زندگی کرتا ہے کہ یہی وقت اور دانش کا تقاضا ہے یہ کہانی کا نٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو پیدا کرتی ہے۔ طوفان میں مسکرانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اس کتاب میں اور بھی کہانیاں ہیں کہ جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔

منٹو، کرشن اور بیدی کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ منٹو کے یہاں ایک ہی تصویر ہے جسے وہ مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے۔ کرشن چندر کے یہاں مختلف تصویریں ہیں جو Moving Stand میں لگی ہوئی ہیں اور وہ جنہیں ایک مقام پر کھڑے ہو کر یکے بعد دیگرے دیکھا جاتا ہے۔ بیدی کے یہاں تصویریں ہیں متنوع اور متضاد۔ اور ان کی دید کے زاویے بھی بدلتے رہتے ہیں اس لیے ان کے یہاں یکسانیت اور یک رنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں تصویروں کے پیچھے بھی حیرتی اور حیرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ شعاعِ نظر کو رنگوں اور پرتوں سے گزرنا پڑتا ہے پھر حقیقت یک لخت نہیں شدہ شدہ منکشف ہوتی ہے۔ انور قمر کو بیدی سے خاص قربت ہے۔ بیدی کا فن اساطیری ہے اور اشاراتی بھی۔ انور قمر بھی حقیقتِ حال کا فی الفور برملا اظہار و انکشاف نہیں کرتے۔ واقعہ بیانیہ کے ذریعے واقعوں کے کندھے پر، آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ کردار ڈھلکی چال سے پیش رفت کرتے ہیں۔ اپنے مقام اور انجام تک پہنچتے ہیں مگر اتنی خاموشی سے کہ بر وقت احساس نہیں ہوتا۔ اس لیے قاری فوری استعجاب سے دوچار نہیں ہوتا۔ مگر تجسس اور تفکر کا شکار ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے کہانی میں چھپی سچائیاں کھلتی اور کھلتی جاتی ہیں قاری تحیر آمیز نشاط سے قریب ہوتا جاتا ہے۔

انور قمر کی کہانیوں میں عدمِ تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کہانی ناقص اور تشنہ نہیں ہوتی۔ وہ مسئلہ پیش کرتے ہیں مسئلہ کا حل نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ادیب کا فریضہ معاملہ کی نشاندہی ہے انجام دہی نہیں۔ وہ راستہ بتاتا ہے

منزل تک نہیں لے جاتا۔ یہ کام راہبر اور رہنما کا ہوتا ہے۔ دراصل انور قمر کی کہانیوں کو سمجھنے کے لیے پیشانی پر بل دینا ضروری ہے۔ یہ سیدھی اور سرل کہانیاں نہیں ہیں کہ پڑھا اور تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔ ان کی کہانیوں میں "شعلۂ شمع انجمن نہیں" "معدود چراغ محفل" کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں شئے ہو یا شخص۔ زماں ہو، مکاں یا لامکاں، ہر ایک پر دھوئیں کا غلاف ہے اس لیے ذہانت اور فکر کی کرنوں کے وسیلے سے حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ فکری مجاہدے کے بغیر ان کے فن کی تفہیم یا قدر شناسی ناممکن ہے۔

وہ لوگ جو زبان و بیان کے رسیا ہیں چبھتے اور دمکتے فقروں پر جان دیتے ہیں، انھیں یہاں مایوسی ہو گی۔ ایسا نہیں کہ انور قمر اچھی نثر لکھنے پر قادر نہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان جذبات اور خیالات کی ترسیل کا ایک اہم میڈیا ہے۔ ان کے افسانے فکری سطح پر اچھوتے ضرور ہیں لیکن انھوں نے اپنے فن کا محاورہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی یا اگر کی تو اس کا سراغ نہیں ملتا۔ فن کار کی بصارت و بصیرت، اس کے تخلیقی جوہر فکری اور فنی دونوں سطحوں پر نمایاں ہونے چاہئیں کیوں کہ فن پارے کی تعین قدر فکر سے ہی نہیں فن سے بھی ہوتی ہے۔ جہاں دونوں معانقہ کرتے نظر آئیں وہاں فن پارہ عام معیار سے بلند ہو جاتا ہے۔

انور قمر کے افسانے اپنے کیف و کم میں اس "لمحۂ موجود" کا استعارہ ہیں جو اپنے دورِ گذشتہ اور دورِ آئندہ سے جڑا ہوا ہے۔ جس میں ہماری نسلوں کا سفر جاری ہے۔ یہ اس زندگی کا تلازمہ ہیں جسے ہم اور آپ، یہ اور وہ جی رہے ہیں۔ کبھی خوش دلی سے اور کبھی بے دلی کے ساتھ۔ کبھی فرش پر رہ کے کبھی عرش کی جانب لپکتے ہوئے یہ افسانے نگاہوں کے دریچوں، کانوں کے پردوں سے گذر کر ذہن کے گنبد میں گونجتے ہیں [illegible] جہاں خانہ دل میں اترتے

ہیں۔ اس طرح قاری بتدریج تاثر، تفکر، تجسّس اور تجسّس سے دوچار ہوتا ہے
غرض انور قمر کے افسانوں میں سیاسی بیداری بھی ہے اور سیاست کا جبر بھی معاش
آگہی بھی ہے اور اس آگہی کا کرب بھی، فرد کی انا بھی ہے اور اس انا کا ٹوٹنا بھی
بھی، علم کا نور بھی ہے اور اس سے دہکتا دوزخ بھی، معاشی تنگ و دو بھی ہے
اور اس کا استحصال بھی۔

بہرحال انور قمر اپنی دید و شنید میں اپنے محسوس و غیر محسوس تجربات میں
اپنے شعور کی رو میں قاری کو شریک کر لینے اسے ایک نامعلوم سی مسرت، حسرت
اور حیرت سے دوچار کر دینے میں کامیاب ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ فنکار اندر
میں تمنا کے دوسرے قدم کا پتہ نہیں چلتا۔ دشتِ امکان ایک نقشِ پا معلو
ہوتا ہے۔ آرزو اور جستجو کے مرحلے مکمل طور پر کبھی طے نہیں ہوتے۔ قد
نئی مٹی، نئی دھرتی سے مس آشنا ہونے کے لیے بہکتے بھٹکتے اور بڑھتے
رہتے ہیں۔

انور قمر کا فنی سفر نہ ہی تمام ہوا اور نہ
رو بہ زوال ہے بیش رفت جاری ہے۔ وہ جمود اور تعطل کے نہیں، تحریک اور
اور تلاطم کے افسانہ نگار رہیں جلسے جلوسوں کی تحریک نہیں بلکہ وہ تحریک جسے افسا
ذہنوں اور دلوں سے نسبت ہوتی ہے اور وہ تلاطم جو سمندر کی سطح پر نہیں بلکہ
اس کی تہہ میں پایا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے قاری کے لیے گہرے بھی ہیں اور
ٹیڑھی کھیر بھی۔

●●

شاعر کی بیاض سے

جاوید ندیم

جاوید ندیم نئی نسل کے ابھرتے شاعر ہیں۔
ان کے کلام میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور لہجے کی تازہ کاری بھی۔
نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔
یہاں ان کی چند منتخبہ نظمیں پیش ہیں، ان نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پیڑوں، پودوں اور پھولوں کو استعاراتی انداز میں برتا گیا ہے۔ جس سے نظموں کی معنیاتی سطح میں ایک تہہ داری پیدا ہو گئی ہے۔
زیرِ نظر نظمیں ان کے مجموعہ کلام "پنچھی رخصت ہوتے" سے منتخب کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ عنقریب ادارہ تکمیل کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔

ادارہ

دو حرف

جاوید ندیم کی شاعری کے بارے میں

عبدالاحد ساز

ادھر چند برسوں میں بمبئی کی شعری فضا میں جو نئی آوازیں ابھری ہیں ان میں جاوید ندیم کی آواز خاصی منفرد اور بآسانی پہچانی جانے والی ہے جاوید شاید کافی عرصے سے شعر کہہ رہے ہوں مگر انہوں نے اپنے آپ کو محسوس کروانا اب شروع کیا ہے۔ ان کے شعری سفر کی ابتداء کے ساتھ سُبک اور سنجل ہندی شاعری کی روایات کا پس منظر رہا ہے اس نے ان کی شاعری کو زمینی جمالیات کی مہک عطا کی ہے۔ جاوید ندیم غزلیں بھی کہتے ہیں، دوہے بھی اور نظمیں بھی۔ دوہوں میں ان کا فکری اپروچ خوب پنپتا ہے اور ان کا ہندی ذخیرۂ الفاظ گاہے گاہے ثقالت کے باوجود دوہے کے مزاج کو سنبھالے رکھتا ہے۔ غزلیں اتنا متاثر نہیں کرتیں، نظمیں، خاص طور پر نثری نظمیں واقعی قابلِ توجہ ہیں۔

زیر نظر نثری نظمیں شاعر کے نیچر کے ساتھ انہماک کی غماز ہیں مناظرِ قدرت بلکہ زیادہ تر درختوں پودوں اور پھولوں (جن کے مخصوص نام ہیں) کی اپنی اپنی نوعیتوں اور زاویوں سے شاعر کے ہاں کہیں رومانی امیج، کہیں احساس، کہیں تاثر اور کہیں فکری جہت پیدا ہوتی ہے۔ اس باب میں جاوید کا مشاہدہ کافی متحرک ہے

جاوید ندیم کی شاعری فی الوقت ایک شعاع کی طرح خطِ مستقیم میں اپنے عبوری فاصلے کو طے کر رہی ہے۔ ابھی وہ پختگی کے اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی جہاں انجذاب، انعکاس اور انتشار سے دوچار ہونا پڑتا ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ اپنے اندر مزید توانائی پیدا کرتے ہوئے یہ شعاع جب احتساب و تنقید کے منشور سے گزرے گی اور اپنی بنیاد کی طرف جھکتے ہوئے ہوئے سات رنگوں میں ٹوٹے گی تو ان میں سے ایک رنگ اس کی اپنی منفرد شناخت کا ضرور ہوگا۔

نظمیں

جاوید ندیم

نارسی

سطحِ زمین سے پہاڑوں کا منظر
بہت خوبصورت، بڑا دل نشیں تھا
جہاں میں کھڑا تھا، وہاں رونق نہیں تھی!

بلندی سے سطح کو دیکھا تھا میں نے
ہر اک سمت نظروں میں منظر حسیں تھا۔
کہ سطح کا چہرہ بڑا دل نشیں تھا
جہاں میں کھڑا تھا وہاں رونق نہیں تھی!

چنبیلی

قریب آؤ کہ جانِ آرزو دیکھو
کھڑی ہوئی وہ چنبیلی کی بیل آنگن میں
سفید پھول، ہری پتیاں، جھکی شاخیں
مجھے یوں لگتا ہے
جیسے جانِ راحت تم
اوڑھ کر منگشد ہری چادر
کھڑی ہوئی ہو وہاں مہکا ہوا بدن لے کے

املتاس

ذہن میں آج بھی میرے تازہ ہے وہ ساعتِ دلنشیں
جب ہم تم ملے تھے
املتاس کے پیڑوں کی ٹہنیاں خوشنما پھولوں سے اپنی زینت کیے
ایک الھڑ حسینہ سی محجوب تھیں
شوق افزا ہواؤں کے جھونکے بدن جن کا چھو کر گذرتے ہوئے
کتنے مسرور تھے
مند خوشبو فضاؤں میں ہر سو اڑی تھی۔
مسکراتی ہوئی شوخ نظروں سے میں نے دیکھا تھا تم کو
اور تم، شرم سے گل مہر ہو گئی تھیں
آج بھی جب کبھی میں املتاس کے پیڑوں پر گل کھلے دیکھتا ہوں
یاد آتی ہے پہلی ملاقات کی وہ ساعتِ دلنشیں
شرم کے بوجھ سے زیرِ پلکیں تمہاری
املتاس کی جیسے جھکی ڈالیاں
اپنی آنکھوں میں محسوس کرتا ہوں میں

● ندرا، تلک روڈ، پونہ ●

نشیبِ راہ کے

وقت تیزی سے دوڑتا رہا
اور اس کے پیچھے میں ۔
ہزاروں مرحلے تھے
رنج اور خوشی
درد اور کرب
لذّت اور اندوہ
گھاؤ اور یادیں ....
وقت —
بے حس تھا،
اور راستہ اس کا ہموار
وہ دوڑتا رہا ......
میں الجھ گیا
کیوں کہ
میری راہ میں نشیب تھے بہت
اور گردشیں ماضی کی !

احتساب

سوچتا ہوں
سفر کی ابتدا سے انتہا تک
کتنی تمنائیں تکمیل کو پہنچیں ؟
کتنے جذبے پامال ہوئے ؟
کتنی شکلیں بھول گیا ؟
کتنے چہرے یاد رہے ؟
پہلے قدم کا جوش مرا
کیا انت یگ تک قائم تھا ؟
کتنا منہا، کتنا جمع
خود سے میں نے خود کو کیا
وقت کی ہاتھوں میزان لیے
کھونا، پانا تول رہا ہوں
سامع میرا کوئی نہیں
خود ہی خود سے بول رہا ہوں !

پھُواں لڑی

زرد بسنتی پھیوں لڑی کی ننھی بیلیں
میں دیکھ کے اکثر سوچتا ہوں
کاش،
میری کوئی محبوبہ ہوتی
تو ــــــ
سر سے پا تک اس کا سراپا
پھیوں لڑی سے میں سجا کر
پہروں نہارا کرتا!
اور اکثر دیکھ کے ان کو
گمان یہ بھی گذرا ہے
کہ جیسے
میری امّی نے،
اپنی ہونے والی بہو کی خاطر
گہنے، سینچ کے رکھے ہیں!

۱۔ گڑھوال میں پائی جانے والی ایک بیل

برانس کے پھول

بُرانس کے پیڑوں پر
میں جب بھی پھول کھلے دیکھتا ہوں
تو مجھے
ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے
میری غریب محبوبہ نے
مجھے دکھانے کی خاطر
اپنے گھر کے
پشتوں سے چلے آ رہے گہنوں کو
پہن لیا ہے!
مگر
وہ ــــــ
پیوند زدہ پیرہن کو
اپنے بدن سے
الگ نہیں کر پائی ہے!

گُل مہر

دیکھتا ہوں
جب کبھی میں گل مہر
تو دھیان تمہارا ....
پہلی شب کی دلہن تم
میرے گھر میں آئی ہو
سرخ بری ہے زیبِ تن
لال حنائی دست و پا
سمٹی سمٹی بیٹھی ہو
شرم و حیا ہے، خوف بھی ہے۔
میٹھے سپنے سوچ نئی
جانے کیا کیا باتیں تم
آنکھیں موندے سوچ رہی ہو
محو، سراپا میں گم
جانم تم کو دیکھ رہا ہوں
آج بھی
(برسوں بعد) مگر
ہر بار وہی اک منظر ہے
دلہن تم ہو — گل مہر ہے !

●

تکیل

●

اکیشیا[۱]

زرد، بسنتی پھولوں سے
پیڑ اکیس کا لہرایا
جیسے پہاڑن دوشیزہ
روپ کی دیوی پاکیزہ
پھول لگا کر بالوں میں
جس کے سانولے گالوں میں
دوڑتی شوخی لوؔن کی
تیز چھری لے چتون کی
گاؤں سے اپنے سج دھج کر
میلہ دیکھنے شہر میں آئی
چال چلے ہے اترائی
تھوڑی تھوڑی شرمائی !

---

۱ برفانی خطّے کا ایک درخت

بھیونڈی

رات رانی

رات کی خاموشیاں
جب کرنے لگیں سرگوشیاں
نیم وا، مدہوش چشمِ شوق سے
دیکھتے ہوئے
لے کے انگڑائیاں
تب ہوتی ہو بیدار تم
تن کے اک اک انگ سے !
خوشبوؤں کی بجنے لگیں
ان گنت شہنائیاں !

●

تکمیل

بُرانس[1] کے پیڑ

پہاڑی نشیب پر
دور تک ساکت کھڑے
بُرانس کے پیڑوں کی بھیڑ
لگتا ہے
جیسے
نیم برہنہ،
کمزور، لاغر، مزدور
پھاوڑے، سبّل، کدالیں
اور
سروں میں تسلے لیے۔
کام میں مصروف ہیں !

●

[1] بُرا ۔ ہمالیائی خطّے کا ایک درخت

بھیونڈی

اختلاطِ جسم و روح

جسم کے پھیلے نگر میں
کالے سناٹوں کا راج
پھر رہا ہے شعلہ اک بھٹکا ہوا آواز کا
جوشِ دریا، شورِ طوفاں
جانے کب سے قید ہیں
زرد آہیں
خونِ اسود
سرخ آنکھیں جا بجا
درد کے روشن دیے
ہر جگہ چورا ہے پر
چپی خاموشیوں میں سرمئی سورج اُگا۔
دیکھو یہ کتنا عجب ہے۔
___ جسم و روح کا اختلاط!

●

●

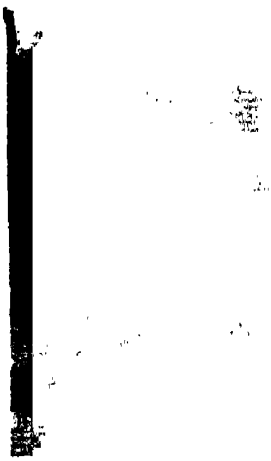
خواہشِ بے ثمر

بارہا سوچا کہ میں
تیرا پیکر
زرد رنگ میں ڈھال کر
کمرے کی دیواروں پر آویزاں کروں

یہ بھی سوچا کہ میں
آنچل ترا
سر سے اپنے باندھ لوں
اور کرلوں، خواب کو تصویر کے رنگوں میں قید

پر ___
نہ جانے کیوں؟
سوچ کا یہ سلسلہ
سوچ سے باہر کبھی جاتا نہیں!

کچھ رام پنڈت کے بارے میں



رام پنڈت

رام پنڈت مراٹھی زبان کے ایک اہم اور معروف شاعر، کامیاب مترجم ہیں۔ زبان اردو سے انھیں گہرا لگاؤ ہی نہیں بلکہ جنون کی حد تک عشق بھی ہے۔ مراٹھی زبان میں تین شعری مجموعے اور ایک دیوناگری میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ تراجم بھی کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بالخصوص کلاسک اردو ادب کو مراٹھی میں منتقل کر کے "آکنٹھ" میں سمو دیا۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے معتبر اور جدید افسانہ نگاروں کے دو انتخاب جنھیں مراٹھی روپ دیا۔ ترجمہ (اوّل اور دوّم) کے نام سے مراٹھی میں شائع ہوئے "رو پانتر" سریندر پرکاش نمبر' اور نئے افسانہ نگاروں کا ایک دستاویزی انتخاب دیوناگری میں شائع کرنے کا سہرا بھی رام پنڈت کے سر جاتا ہے۔ فی الحال اردو کے جدید شعراء کا ایک انتخاب مراٹھی روپ کے ساتھ زیرِ ترتیب ہے۔ اور بہت سارا اردو ادب مراٹھی زبان میں منتقل کرنے کا منصوبہ بناتے ہوتے ہیں۔ مراٹھی قارئین تک اردو ادب کو پہنچانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ!! جس کے نتیجہ میں رام پنڈت کو مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی جانب سے "مراٹھی اردو خدمات" پر ریاستی سطح کے ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

ادارہ اردو داں مراٹھی شاعر کی اردو نظمیں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے

ایک کالی کمپوزیشن

رام پنڈت

اے ! تاریخ نویس
دل کے بے سکوں کاغذ پر
پیاسے لفظوں میں رقم کرو
اس خشک صدی کی تاریخ
لکھو
کہ گزشتہ دور میں اس ملک کی ہر کوکھ سے
فقط شری کھنڈی کی نسل پیدا ہوئی
اور فصل سی پھیل گئی
لکھو
کہ اس سرزمین پر
ہوس و حرص کے درندے
عوام میں کھلے عام گھومتے تھے

اور
شرمناک وارداتوں کو انجام دینے کی عوض میں
انھیں سماجی رتبہ بخشا جاتا تھا
قوم، مذہب کے ٹکراؤ میں بے وجہ اجنبی شخص
لاش بن جاتا تھا
پھر بھی عوام لاشوں میں آدمی کو کھوجتی تھی
وارداتوں سے پھوٹ پڑتی تھی کمینی داستانیں

اور شہر و ملک کی شریانوں میں
پھیلتی تھی چند گھنٹوں میں
زندگی کے شفاف پانی میں
امرت کے مانند زہر گھولتی تھی
لکھو
کہ اس مٹی کی رگوں میں
بغاوت کے خون کا ایک قطرہ بھی رواں نہیں تھا
اور ہر تخلیقی قلم
ناجائز تعلقات کے سبب
بے وقت بوڑھا ہو چکا تھا، تھک چکا تھا۔
لکھو
ذہن کو سمندر، دل کو آسماں بنا کر
بے جھجک لکھو
دھند میں لپٹی اس صدی میں ہی شائع کرو
یہ تاریخ
ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ
اس لمحہ تاریخ میں تم خود رقم ہو جاؤ ـــ !

۴۵۹/۱۴ ، نہرو نگر ، کرلا (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۲۴

لمحوں کے پروں کو کاٹ دو

پلک جھپکتے ہی اوجھل ہو جانے والے
خوش بو بن بن کر فضا میں تیرنے والے
تنہائی کے آنگن میں اردگرد منڈلانے والے
ان لمحوں کے پروں کو
کاٹ دو
تاکہ ———
آج کے یہ سکھ دکھ کے لمحے گذر نہ جائیں
جب جی چاہے، ہم انھیں پاس بلا سکیں
اور ان ہی میں جی سکیں
چند برس ———
چند دن ———
چند لمحے ———

نئے دستخط

نئے دستخط میں شمار ہونے والے
رے — واؤ — سپے
اس مختصر دستخط کے لیے
بھاگ دوڑ کر
آٹھ بیس کی ڈبل فاسٹ
پکڑنے کی پوری کوشش میں
ہفتے کے پانچ دن دفتر میں گذارتے ہیں
تکمیل
وہ مختصر دستخط
جو ہماری روٹی — روزی ہے
تنخواہ ہے
جب بند ہو جائے گی، تب
طویل دستخط کے سوا کیا بچے گا ہمارے پاس
فقط ———
لفظوں میں بھیگی طویل خوش بو

اشارہ

گم شدہ تہذیب کے پاس یا لو !
سنبھلو
دیواریں اب گرنے کے قریب ہیں
سلے ہوئے لبوں کے ٹانکے
کھلنے لگے ہیں دھیرے دھیرے
اشکوں کو قید کیا تھا جن گنہ گار آنکھوں نے
وہ ہی اب
سیاہی کی گھور زنجیر میں
جکڑے جائیں گے
خشک پلکوں سے
صدیاں گننے کا موسم اب بیت گیا
اب راہیں خود لے جائیں گی
منزل کی جانب قدموں کو ———

احساس

جسم کے بھیتر کا یہ شہر
پرایا ہو چلا ہے
وجود کے عالم کا کوئی سراغ
محسوس نہیں ہو رہا
شاید
مجھ سا ہی کوئی اندر
ہر پل گذر رہا ہے
یا پھر
میرا ہی سایہ بھیتر ٹہل رہا ہے

پیش لفظ

چند لفظ میرے
خوشبوؤں سے بھرے
شاخ خوں سے ہرے
ہائے ایسے
بھور کی کرن
پیڑ تلوں سے نکل
پانی سے پھسل
جائے جیسے

تکمیل

آئینہ

ہر چہرے کی نقل کرنے کے سوا
آتا بھی کیا ہے
اس آئینے کو
توڑ دوں
تو دس ـ بیس نقل کرنے والے
اور بڑھ جائیں گے
رکت بیج کی طرح
بہتر یہی ہے
کہ اس پر گرد ہی جمنے دو

ریوڑ سے الگ

رقص کرتی ہوئی لاشیں
ہاتھوں میں شمعیں لیے ہوئے
اندھیرے کو
چیرتی ہوئی
گذر رہی ہیں مرگھٹ سے جیل کی اور
میں نے چتا سے اٹھ کر یہ منظر دیکھا
اور
آنکھیں موند لیں
لکڑیاں پھر سے اوڑھ لیں
شعلوں کو لپیٹ لیا
میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا

بھیونڈی

ایک نظم

لوگو! آؤ یہاں
یارو جلدی آؤ
قافلہ یہیں روکو
دیکھو یہ شہر بالکل خالی ہے
یہاں کا ہر مکان خالی ہے
چلو یہیں پر بسائیں اپنی بستی
اس شہر کے جسم میں پران پھونک دیں ہم
پر کہاں گئے ہوں گے اس شہر کے لوگ؟
کیوں گئے ہوں گے اپنے گھروں کو چھوڑ کر؟
ہمارے بچوں کا بچپن
کسی کے اجڑے ہوئے آنگن میں کیسے گذرے گا؟
رہ رہ کر اپنے گھر کا آنگن
دھوپ میں نہاتا ہوا کوٹھا
بارش میں بھیگی گلیاں
پل بھر میں اجڑ گیا وہ شہر
کیوں یاد آرہا ہے۔
وہاں کس کا قافلہ رکا ہوگا؟

میں فریب ہوں

کائنات ہی سچ ہے
کائنات ہی فریب ہے، جھوٹ ہے
میں کائنات ہوں
میں سچ ہوں، میں جھوٹ ہوں
ذرّے ذرّے میں
قطرے قطرے میں کائنات ہے
ہر ذرّہ، ہر قطرہ
سچ ہے
ہر ذرّہ، ہر قطرہ جھوٹ ہے۔
میں ذرّہ ہوں، میں قطرہ ہوں
کائنات ایک ذرّہ ہے، ایک قطرہ ہے۔
میں ہوں؟
یا کہ میں نہیں ہوں؟

اُداسی

ساگر سرحدی

آج پھر میں نے اخبار چھان مارا ہے اور آج بھی جیت کی خبر نہیں چھپی۔ میں پچھلے کئی دنوں سے بلکہ مہینوں سے اخبار دیکھ رہا ہوں اور BURNINGBRIDES کی ساری خبریں پڑھ رہا ہوں۔

دلی، احمد آباد، بمبئی، کلکتہ، بھیونڈی میں جہاں جہاں دلہنوں کو مارا گیا ہے تیل چھڑک کر جلایا گیا ہے میں نے سب خبریں کاٹ کر جمع کر لی ہیں۔

روز ایک ایک کترن کو دیکھتا ہوں چھوتا ہوں پڑھتا ہوں۔

ہر کترن کو کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اخبار کی ایک ایک کترن دراصل ایک عورت ہے اپنے ماں باپ کی بیٹی ہے جنھوں نے اس کا بیاہ رچایا ہے، جہیز دیا ہے، بہت ارمانوں سے سسرال بھیجا ہے اور آج وہ لڑکی وہ عورت اس دنیا میں نہیں ہے۔

مار دی گئی ہے۔

جلا دی گئی ہے۔

یہ خبریں پڑھ کر ہی میں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے۔

اس سے پہلے مجھے جیت کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس کی شادی ہوئی۔

وہ چلی گئی۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔

آج کل ہر روز اخبار میں عورتوں کو جلانے کے بارے میں پڑھتا ہوں مجھے ایک فکر پیدا ہو گئی ہے یہ کوئی معمولی فکر نہیں ہے۔ اس میں میری سوچ شامل ہے۔ یہ فکر ملیریا کی طرح مجھ پر

لاری ہے میں ہر وقت بخار میں جل رہا ہوں۔
ایک لڑکی ہنستی بولتی گاتی اب اس نگری میں ہے یا نہیں ہے۔ زندہ ہے یا مرگئی ہے یہ سانحہ کوئی معمولی نہیں ہے۔ جوں جوں اس کے بارے میں سوچتا ہوں بات اور گمبھیر ہو جاتی ہے پھر عورت کی جان لینے کے لیے ایک جہیز کا بہانہ ہی نہیں چاہیے اس دیس میں۔ کوئی بھی بہانہ ہو سکتا ہے زمین کا جائیداد کا، پھر مرد عورت کی وفاداری پر شک بھی تو کر سکتا ہے، مرد میں خود مرد ہونے کی کمی کا احساس ـــــــ کوئی بھی بہانہ عورت کے قتل کی وجہ بن سکتا ہے۔
اور جب میں یہ باتیں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ ملک ایک قتل گاہ ہے جہاں عورتوں کو آئے دن قتل کیا جاتا ہے۔
فضا میں دھواں سا بھر گیا ہے۔ گوشت جلنے کی بو، مٹی کے تیل کی بو، کپڑے جلنے کی بو
اور کچھ آوازیں بھی شامل ہیں اس فضا میں۔
ہلکی ہلکی چیخیں۔
دبی دبی سسکیاں، سسکیاں۔
لفظ ـــــــ "بچاؤ!" ـــــ رات کے سناٹے میں اُبھرتا ہے دن کے اُجالے میں
آگ کے شعلے کی طرح لپکتا ہے
یہ سب سوچ کر میں اُداس ہو جاتا ہوں
اور جیت میری بیوی بھی نہیں ہے۔
بہن بھی نہیں۔
دوست بھی شاید نہیں۔
بس ذرا سا اِنسانیت کا رشتہ تھا ـــــــ اور اس رشتے کو کون مانتا ہے
اُن دنوں جیت کا کسی مرد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور میں تنہا تھا۔ لڑکی کا بنا کسی تعلق کے رہنا ہمارے سماج میں بہت مشکل ہے۔ وہ سب کی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ اور جیت کے لیے تنہائی ایک اذیت ناک SITUATION ـــــ ہے
"ملتی ہو"۔ میں نے اُس سے پوچھا تھا

وہ اِن دو لفظوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ ان لفظوں میں پیار شامل نہ تھا۔ بنا پیار کے کوئی آدمی لڑکی سے یہ الفاظ کہے یہ بہت دردناک بات ہے ایک طرح سے یہ اُس کی کی بے عزتی ہے۔

اُس نے میری طرف دیکھا پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ہاں نہ کی۔

مرد کی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے جو کسی لڑکی سے کہے "ملتی ہو" اور وہ لڑکی ہاں نہ کرے اُسے رجیکیٹ کر دے۔ شرمندگی کا احساس ہوتا ہے اور پھر اُداسی چھا جاتی ہے

اُن دِنوں جیت ہر جگہ پائی جاتی ـــــ تھیٹر میں ناٹک کے شو میں کسی ریہرسل پر بھی کسی پارٹی میں بھی۔

وہ خوب چہکتی رہتی جیسے دنیا کو جتلانا چاہتی ہو کہ وہ بہت خوش ہے کسی طرح کی کوئی پریشانی اُسے نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ لوگوں میں گھری رہتی۔

وہ ایک فیملی کے ساتھ پئینگ گیسٹ کے طور پر رہتی تھی وہ اکیلی تھی اس لیے اُسے بہت فون آتے ہر مرد کچھ نہ کچھ آفر کرتا۔ اس طرح وہ دو ایک ڈراموں کی ریہرسل بھی کر رہی تھی اس طرح دو ایک اور فلمی کانٹریکٹ بھی سائن کر چکی تھی کیونکہ ابھی تک اس کا تعلق کسی مرد کے ساتھ نہ ہوا تھا، وہ کسی نام کے ساتھ جڑی نہ تھی اِس لیے ہر مرد کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کے ہاتھ لگ جائے۔

میں بھی اس بھیڑ میں شامل تھا۔

جس گھر میں وہ رہتی تھی وہاں زیادہ لوگ نہ تھے پتی ایک عام سا آدمی تھا چھوٹا موٹا بزنس کرتا تھا۔ پتنی شکل کی اچھی تھی۔ ایک بچہ تھا اور لڑکے کی ماں ـــــ اب جیت بھی گھر کا ایک فرد سمجھی جاتی تھی۔ اکثر وہ ماں کے ساتھ کچن میں رہتی، بہو گھر کا کام کاج کم ہی کرتی۔

جیت جب میک اَپ کے لیے آئینے کے سامنے بیٹھتی تو بہو اُسے دیکھتی رہتی۔

بہو جیت کے میک اپ باکس کی چھان بین کرتی۔ کبھی کوئی چیز زبردستی مانگ کر لیتی اور کبھی چوری کر لیتی، پوچھنے پر مکر جاتی۔ وہ جیت کو کسی فون کا میسج نہیں دیتی جب جیت فون پر بات کرتی تو بہو اس کے پاس آ بیٹھتی اور اُٹھنے کا نام نہ لیتی جیت جب ہاتھ

گھر لوٹتی تو دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے اور گھنٹی بجانے کے بعد دروازہ کھولتی۔

بہو ظاہری طور پر اس کی زندگی سے نفرت کرتی تھی کہ وہ آزاد ہے' اُسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ آزاد ہونے کا مطلب عورتوں کی ڈکشنری میں گالی ہوتا ہے۔ کم از کم ایک بوائے فرینڈ ہونا چاہئے تھے۔ یہاں تو کسی کے بھی فون آتے تھے مگر اندر سے وہ جیت سے رشک کرتی تھی' وہ اِسکی طرح من مرضی نہیں کر سکتی۔ کہیں آجا نہیں سکتی اسے کوئی فون نہیں کرتا سبزی خریدنے کیلئے ساس سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ اس کا پتی تھا بس۔ پتی بھی پتی جیسا کوئی خاص بات نہیں تھی اِس میں۔ اُس پر ایک بچہ اُس کا پلو پکڑ کر گھومتا رہتا۔

پھر ایک دن اچانک مجھے جیت کا فون آیا ـــــ ایسا بہت دنوں بعد ہوا تھا۔ وہ اِسطرح ہنس کر باتیں کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن میں وہ بات نہ بھولا تھا۔ میں نے کہا "کھنڈالہ چلتی ہو۔؟"

اس نے پوچھا کب ؟

زندگی میں پہلی بار لڑکی کے ہاں کرنے پر میں خوش نہیں ہوا تھا۔ میں اور وہ ساتھ لیگ گاڑی میں جائیں گے۔ میں اس سے کون سی نئی باتیں کروں گا جو پہلے کسی سے نہیں کی ہیں! وہی ان گنت بار دہرائے ہوئے فقرے۔ ہماری سانسیں ٹکرائیں گی جسم ایک دوسرے کو چھوئیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے سے پیار بھی نہیں۔ محبّت کے بنا یہ بڑا المناک سفر ہے۔ دولوں کی ذات کی نفی ہے اِس کے علاوہ ہم نے زیادہ وقت ساتھ بھی نہیں گذارا تھا کہ ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی عادت ہو جائے' ذرا کا پہچان ہو جائے۔ ہیلو اور گڈ بائی کا ہی تعلق تھا ہم میں۔ پھر اس کا اس طرح رضا مند ہو جانا حیرانی کی بات تھی۔

وہ کس قدر تنہا ہو گی۔ اس طرح کے فون کالز کے بعد وہ ہنس ہنس کر کتنی بار روئی ہو گی گھر میں بہو کے ہاتھوں تنگ اور باہر گمنام مردوں کا ہجوم جو چیل کوّوں کی طرح اس کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ' بھائی بہن کا سہارا بھی نہیں کوئی سکھی سہیلی بھی پاس نہیں جس سے وہ دل کی بات کر سکے۔ مردوں کی اس دنیا میں وہ اکیلی کیسے رہ سکتی ہے۔ کوئی چارہ نہیں اسے کسی ایک مرد کو چننا ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ کی طرح۔ رام نکل آئے یا راون' اُسے اس اِمتحان سے

گزرنا ہے۔

سوئمبر کی رسم میں تو مردوں کی بنائی ہوئی تھی۔ سوئمبر میں تو کوئی شرط ضرور تھی کوئی کارنامہ لازمی تھا اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں سینے پر ایک پر اگزیٹنگ لگا ہونا چاہیے وہ بھی کتنا سچ ہے کیسے معلوم۔

وہ مجھے بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر چھوڑنے آئی تھی۔ سوتی کی ایک ڈھیلی ڈھالی میکسی پہنے، وہ خانہ بدوش لگ رہی تھی۔ پاؤں میں معمولی سی چپل تھی۔

جیت تم بھی چلو میرے ساتھ دلی۔

مذاق کرتے ہو؟

نہیں

سچ کہہ رہے ہو؟

ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔

لیکن میں ایسے کیسے جا سکتی ہوں ان پہنے ہوتے کپڑوں کے ساتھ؟

وہاں دو جوڑے خرید لینا دو چار روز میں واپس آجائیں گے۔" واقعی سچ کہہ رہے ہو"

واقعی سچ کہہ رہا ہوں

لیکن گھر میں بھی تو میں نے کچھ نہیں کہا۔

کون سا گھر ہے تمہارا ______ فون کر کے بتا دو تمہاری شوٹنگ ہے یا گھر والوں نے بلایا ہے منگنی ہو رہی ہے یا سیدھے شادی کا بول دو۔

واپس آؤں گی تو کیا جواب دوں گی۔؟

کہہ دینا ڈائی وورس ہو گیا۔ یا لڑکے نے تمہیں رجکیٹ کر دیا خوبصورت لڑکی کھلکھلا گئی اس نے اپنی میکسی کے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ریزگاری کے ساتھ دس بارہ روپے تھے اس نے نیم مسکراہٹ کے ساتھ ساری پونجی مجھے دکھائی۔ میں نے کہا اتنے پیسوں میں تو ورلڈ ٹور کر سکتے ہیں!

پلیٹ فارم پر ایک سینیر ٹی ٹی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کنفرم کر رہا تھا۔ میں سیدھا اس کے پاس گیا۔

EXCUSE ME یہ میری گرل فرینڈ ہے۔ مجھے اسٹیشن چھوڑنے آئی ہے۔ میں چاہتا

ہوں میرے ساتھ دلّی چلے

پہلے وہ ہم دونوں کو ہکا بکا دیکھتا رہا پھر پوچھا' آپ کا سیٹ نمبر ؟

میں نے اپنا ٹکٹ دکھایا۔ اس نے کہا۔ آپ جائیے میں وہیں آکر ٹکٹ بنا دوں گا۔

میں نے جیت سے کہا چلو دلّی۔

وہ اب تک مذاق سمجھ رہی تھی لیکن جب اسے احساس ہوا کہ وہ واقعی میرے ساتھ جا رہی ہے تو اس نے سب کے سامنے لوگوں کے ہجوم میں مجھے گلے لگایا۔ میرا گال چوما۔ YOU ARE DARLING! اور چھلانگ لگاتی ہوئی فون کے پاس گئی۔ بات فون پر کر رہی تھی' دیکھ میری طرف رہی تھی۔ ایک منٹ میں واپس آگئی۔ ایک لفظ کہا DONE

اور اس طرح وہ خانہ بدوش لڑکی کاٹن کی ایک میکسی پہنے' کولھا پوری چپل پیروں میں ڈالے میرے ساتھ دلّی روانہ ہو گئی

جب ٹی ٹی ٹکٹ بنانے کیلئے ہمارے کمپارٹمنٹ میں آیا' تو بہت دیر تک ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اس کو چائے پلائی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی جہاں جاتی ہے خوشی بانٹتی رہتی ہے۔ ٹی ٹی بہت دیر تک ڈیوٹی چھوڑ کر اس کے ساتھ گپیں مارتا رہا۔

آپ ہمارے ساتھ دلّی جا رہے ہیں نا؟

نہیں میری ڈیوٹی نہیں۔

ہاؤ سیڈ ——— بڑا مزا آتا۔

جب ٹی ٹی اس کو بائی کہہ کر اترا تو مجھے لگا کہ دو دوست الگ ہو رہے ہیں

پورے سفر میں چہکتی رہی

I'CANT BELIEVE IT

YOUARE DARLING!

YOUARE

YOU ARE SWEET

پھر پتہ نہیں کتنے فقروں سے اس نے مجھے نوازا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ دلی میں ذرا ذرا سردی شروع ہو گئی تھی شام کو تو خنکی بڑھ جاتی تھی میں اپنے دو چار دوستوں کے ساتھ کناٹ پلیس پر گپیں مار رہا تھا۔ اچانک جیت نے جھرجھری لی وہ سردی سے کانپ گئی میں چلایا الو کی پٹھی کیا ہل ہل کر کتھا کلی کر رہی ہو!

وہ اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ سب کے سامنے بولی میں کیا کروں میکسی کے نیچے کچھ بھی نہیں نا ٹھنڈ لگ رہی ہے۔

اور میں اس پر برس پڑا کہ وہ اپنا خیال نہیں رکھتی۔ بیمار ہو گئی تو مصیبت آجائے گی میں نے اپنا پرس دیا اور وہ تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی پرس لیے نکل گئی اور ڈیڑھ دو سو کے اسی طرح خانہ بدوشوں کے کپڑے فٹ پاتھ سے خرید کر واپس آگئی۔ میرا پرس میری پچھلی جیب میں ڈال دیا۔ میں کپڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ لڑکی کتنی سادہ ہے کتنی بے غرض ہے۔ زندگی اس کے ساتھ کیا کرے گی۔

میں نے اس طرح کی بے غرض لڑکی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی جو ہمیشہ آپ کا خیال رکھے آپ کی ہر بات مانے آپ کا جی بہلاتی رہے۔ ہر حال میں خوش رہے۔ اس کی کوئی مانگ نہیں۔ پھر وہ بہت صحت مند تھی ہر وقت گھومنا پھرنا، پیدل چلنا سفر کرنا ہر بات کے لیے تیار کئی بار وہ کمرے کا کرایہ نہ دے پاتی اور اس کا ذکر تک نہ کرتی کبھی اتفاق سے ذکر نکل آتا تو ہنسی میں اڑا دیتی جیسے یہ بے حد غیر ضروری بات ہے توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں۔

ہم دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے میرا ہاتھ سیٹ کی پشت پر پھیلا تھا اس کا سر میرے بازو پر تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ اس طرح کی باتیں وہ بہت کرتی تھی۔ زیادہ وقت ہنسی مذاق میں گذار دیتی۔

میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں آج کل میں اسی طرح کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ آپ مجھے کہاں مل گئے — پہلے کیوں نہ ملے — میں آپ کے ساتھ اسی طرح رہنا چاہتی ہوں۔

اس نے سیفٹ سے میرا بازو لیا۔ پھر میرے ہاتھ کو اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹا۔ آنکھوں سے چھوا۔ گالوں سے مس کیا۔ پھر ہونٹوں سے لگایا۔

اور وہ خاموش ہو گئی۔

آدمی اس کے بعد کیا کہہ سکتا ہے ـــــــ روزمرہ کے جینے میں ایسا واقعہ کہاں آتا ہے اس طرح کے فقرے کون بولتا ہے آج کل۔

ہم دونوں کی زندگی نفی سے شروع ہوئی تھی۔ ملاقات پر دو زیرہ تھے۔ دونوں زندگی سے ناخوش کشمکش میں مبتلا' اکیلے' تنہا' مرے ہوئے استعمال شدہ آدمی کے خاکے پورے آدمی بھی نہ تھے۔

اس کے ہاں کرنے کے بعد میں بہت خوف زدہ تھا۔ ایک اور رشتہ کی ذمہ داری ایک اور تعلق کا بوجھ۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ نئے آدمی سے راہ و رسم کروں۔ یہ جیت کی خوبصورتی تھی کہ اس نے مجھے اس سچویشن سے نجات دلائی۔

ہم دونوں بہت قریب تھے۔ ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے میں نے اس سے کہا' جیت تم کیا سوچ کر میرے پاس آئی تھیں مجھ میں کیا خاص بات تمہیں نظر آئی وہ بہت دیر خاموش رہی ـــــــ پھر بولی سمجھنا سمجھانا بہت مشکل ہے آپ مجھے اچھے تو لگتے تھے لیکن میں نے آپ کے بارے میں اس طرح کا رشتہ نہیں سوچا تھا لیکن جب میں آپ کے ساتھ کھنڈالہ گئی تو آپ نے جس طرح میرا خیال رکھا بس میں پگھل گئی۔ میرے سر کے نیچے آپ کا ہاتھ' باہر نکلنے کیلئے کار کا دروازہ کھولنا' زمین سے اُٹھنے کے لئے ہاتھ بڑھانا' اُٹھ کر پانی کا گلاس پیش کرنا' اکیلی تنہا کٹی ہوئی لڑکی کے لیے چھوٹی چھوٹی بے معنی سی باتیں' اسے مار دیتی ہیں' غلام بنا دیتی ہیں۔

بس پہلی اور آخری سنجیدہ بات چیت ہم دونوں کے بیچ میں ہوئی۔

اور جیسے وہ غائب ہو گئی۔ جیسے کسی نے اُسے سطح زمین سے اٹھا لیا ہو' جیسے اس کا قتل ہو گیا ہو' جیسے دیواریں کھڑی کر کے اسے قید کر لیا گیا ہو۔

بہت دنوں کے بعد زندگی اچھی لگنے لگی تھی ـــــــ پہلی بار مستقبل کے خواب دیکھنے لگا تھا ـــــــ ہر کام میں دلچسپی بڑھ گئی تھی ـــــــ بہت لگن و چاؤ سے اپنا کام انجام دے رہا تھا ـــــــ

زندگی کی جدوجہد روزمرہ کی مصیبتوں مایوسیوں سے دوچار ہونا' اب بہت معمولی سی بات نظر آتی ہم روز صبح ایکدوسرے کو فون کر دیتے اور ایکدوسرے کی مصروفیات سے آگاہ ہو جاتے۔ فرصت ہوتی تو مل لیتے۔ نہ ہوتی تو دوسرے دن پر ملتوی کر دیتے

میرے کہنے پر اس نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کھانے پینے میں احتیاط برتنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے جسم کی چربی کم ہونے لگی تھی۔ ورزش کرنے لگی تھی اس کے نقوش تیکھے ہونے لگے تھے۔ کپڑوں کے بارے میں بھی وہ اب محتاط ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے پروفیشن میں کامیاب ہو جائے گی۔ دیانتداری محنت اور لگن سے وہ اپنے لیے چھوٹی موٹی جگہ بنا لے گی۔

وہ میرے ساتھ دیکھی جانے لگی تھی اس لیے مردوں کے فون کم ہونے لگے تھے۔

میں اس سے ملنے کئی بار اس کے گھر گیا۔ بہو سے باتیں بھی کیں۔ تھوڑی سی تعریف کر دی اُسکی دو ایک بار اپنے ساتھ اسے ہم کھانا کھلانے بھی لے گئے۔ میں نے جیت اور اپنے رشتے کے بارے میں بہو سے کچھ نہ کہا لیکن وہ سمجھ گئی کہ جیت اب اکیلی نہیں ہے۔ میں اس کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ اگر اس نے جیت سے بدسلوکی کی تو مجھ میں ہمت ہے کہ دوسری جگہ کا بندوبست کر لوں۔

میں نے بہو سے جیت کے بارے میں پوچھا اس نے کہا وہ تو چلی گئی ہے۔ کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی خوشخبری سنا رہی ہو۔

چلی گئی ہے۔ معنی ؟

چلی گئی ہے معنی چلی گئی ہے۔ سارا سامان اُٹھا کر۔ اب وہ یہاں نہیں رہتی ۔

کچھ بتا کر گئی ہے۔؟

نہیں

کہاں گئی ہے ؟

مجھے کیا معلوم !

میرے پاس سوالوں کا انبار تھا میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا جاننا چاہتا تھا' لیکن اس نے فون رکھ دیا۔

اور مجھے جیت کا ایک لفظ یاد آ گیا۔ فون پر ہماری بات ختم ہوتی تو وہ کہتی "رکھ دوں"۔ ؟

یہ کوئی موقعہ تھا کہ اس کا بولا ہوا لفظ یاد آجاتا!

اب کی بار مجھے احساس ہوا کہ میں جیت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ دونوں نے اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ ایک رشتہ بن گیا تھا اور دونوں مطمئن تھے۔ وہ کہاں سے آئی ہے اس کے ماں باپ کون ہے کہاں رہتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اس سے کیسا سلوک کرتے ہیں یہ بھی تو معلوم نہیں۔

اور مجھے جیسے چپ لگ گئی —— مشین کی طرح سب کام کرتا۔ کھانا کھاتا، شراب پیتا، گاڑی میں بیٹھتا اخبار پڑھتا ڈرائیور کو ہدایت دیتا۔ سب کچھ ویسے ہی چل رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

صرف میں نے جیت کو کھو دیا تھا۔

ایک بات کا میں نے خیال رکھا۔ گھر سے آفس اور آفس سے گھر —— اس کے علاوہ میں نے آنا جانا بند کر دیا تھا —— نہ جانے کب اس کا فون آجائے، کہیں دستک سنائی دے کوئی خط کوئی خبر۔

ایک دن کسی نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور جیت ہوا کے ساتھ اندر آئی اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ شاید وہ جیت کی حالت دیکھ کر روئی ہوگی۔

جیت نے مجھ سے کچھ نہ کہا —— بس روتی رہی۔

میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ جیت رو سکتی ہے۔

دیر تک رونے کے بعد اس نے کہا، میرے بھائی اچانک آدھی رات کو کمرے میں داخل ہوئے میرا سامان اٹھایا، مجھے دھکیل کر گاڑی میں بٹھایا۔ کسی کے گھر لے گئے۔ اور کہا میری شادی طے ہو گئی ہے۔ میرا باہر نکلنا بند کر دیا۔ بات چیت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ٹیلی فون پر جاتی تو میری ہونے والی نند ساتھ رہتی۔ باتھ روم میں بھی وہ تقریباً میرے پاس رہتی۔ بھائی گھر میں پہرہ دیتے رہے کئی دن تک۔ اور جب میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا تو وہ اپنے ساتھ مجھے باہر لے جانے لگے۔

آج مہینوں کے بعد مجھے موقعہ ملا ہے۔ میں بہانہ کر کے آئی ہوں کہ میری کچھ ضروری چیزیں بھابی کے پاس رہ گئی ہیں —— بھائی مجھے ان کے یہاں چھوڑ گئے اور ان کو ہدایت دے گئے ہیں کہ میری نگہبانی کریں، مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔

کیا ہے۔ دھوکا دیا ہے مجھے معاف کر دیجئے۔

اور بے اختیار رو پڑی۔ بہو کچھ دور بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

اور مجھے احساس ہوا کہ جیت ایک عورت ہے۔ صدیوں سے مردوں کی غلام۔ بھائی بہن ماں باپ روایت۔ رسم و رواج کے ہاتھوں قیدی۔ وہ آزادی ہنس کر باتیں کرنا۔ گھومنا پھرنا۔ سب جھوٹ تھا اُس کا ذہن آزاد نہ تھا ——— اُس کی اپنی کوئی مرضی نہ تھی، کوئی زندگی نہ تھی، کوئی سوچ نہ تھی کیوں کہ وہ عورت تھی۔

میں کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں آسمان پر بادل چھائے ہیں۔ اُمس ہے گھٹن ہے پانی برسا نہیں ابھی تک۔

میں روز اخبار پڑھتا ہوں ساری خبریں دیکھتا ہوں BURNING Brides کی کوئی خبر نہیں چھوڑتا۔ بہت دن، بہت ہفتے، شاید برس گزر گئے ہیں۔ جیت سطح زمین اُٹھالی گئی ہے یا زمین نے اُسے نگل لیا ہے

میں اخبار کی جمع کی ہوئی ایک ایک کترن دیکھتا ہوں پڑھتا ہوں۔ ہر کترن ایک لڑکی ہے، ایک عورت ہے

ایک لڑکی ہنستی بولتی، گاتی، گھومتی اب اس نگری میں ہے یا نہیں۔ زندہ ہے یا ماردی گئی ہے۔

اور یہ ملک ایک قتل گاہ ہے۔

یہاں عورت کو قتل کیا جاتا ہے۔

جلایا جاتا ہے

اور جیت میری بیوی بھی نہیں ——— بہن بھی نہیں۔

دوست بھی شاید نہیں۔

بس ذرا سا انسانیت کا رشتہ ہے۔

اور اس رشتے کو کون مانتا ہے !!!!

●●

فاختہ پوچھتی ہے؟

حسین الحق

بڑا کمرہ

"مِٹھّو! روزی بھیجو مِٹھّو روزی بھیجو" بڑی بڑی مونچھوں والا چابک لہرا کر کہتا ہے "مِٹھّو! روزی بھیجو"۔ زیادہ تر لوگ ایک مہیب ہم آہنگی کے ساتھ کہتے ہیں

دو چار چُپ رہ جاتے ہیں تو شڑاپ شڑاپ چابک برسنے لگتا ہے "بول حرام زادے بول"۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور تب سب لوگ جلدی جلدی بولنے لگتے ہیں ——— "مِٹھّو روزی بھیجو ——— مِٹھّو روزی بھیجو!"

چھوٹا کمرہ

سیلن اور بدبو سے بھرپور، تعفّن سے دماغ پراگندہ، اندھیرا، مچھّر، کھٹمل، ایک جھلنگا چارپائی ——— ایک شخص ——— صرف ایک شخص ——— وہ شخص آہستہ سے گنگناتا ہے ——— کوئی راہ میں چاہی نہیں، پھر آہستہ سے اٹھ کر کھڑکی کھولتا ہے، چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا، ہواؤں کے تھپیڑے فضاؤں میں سر پٹخ رہے ہیں۔ آنکھوں پھاڑ پھاڑ کر نہ جانے کیا تلاش کر رہا ہے، جب کچھ نہیں مل پاتا ہے تو کھڑکی پہ سر ٹیک کر آہستہ سے بڑبڑاتا ہے ——— "نیکی کی دلہن کہاں کھو گئی سید احمد؟ "میں رحم کی دلہن ہوں، مجھے اپناؤ گے؟"

اندھیروں سے ایک شبیہ ابھر کر دریچے پر آ ٹھٹھکتی ہے اور وہ جلدی سے دریچہ بند کر دیتا ہے۔

بڑا آنگن

خلقت کا اژدہام، سب اپنے اپنے کام میں مشغول، کوئی کرسیاں بُن رہا ہے، کوئی چکّی چلا رہا ہے، کسی کے ہاتھ ریڈیو بنانے میں معروف، کسی کی زبان عبادت میں مشغول، کچھ لوگ کھیت

سر سید کالونی، نیو کریم گنج۔ گیا (بہار)

...لت رہے ہیں اور کچھ فائلوں پر جھکے ہوتے ہیں۔

کام کرتے کرتے کبھی کوئی سر اٹھا کر چھوٹے کمرے کی طرف دیکھتا ہے مگر عین اسی لمحہ بڑے کمرے سے شڑاپ شڑاپ کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں اور پھر کورس کی آواز سنائی دیتی ہے ___ منظور روزی پھو ...ظور روزی پھو ___ اور دیکھنے والا جلدی سے سر جھکا کر کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ایک دوسرے سے پوچھتا ہے کیا ہوا؟ اور جواب ملنے سے پہلے ...ڑاپ شڑاپ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور اسی لمحہ مُنادی کرنے والا منادی کرتا گزرتا ہے ___ ...لک عوام کا ___ حکم طاقت در کا! اور سوال کرنے والا خود بدک کر جواب دینے والے سے دور بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

اور چھوٹے کمرے کے چاروں طرف اندھیرا گہرا سفاک اندھیرا، صرف دریچے پر کسی پرچھائیں ...پھڑپھڑاہٹ کا گمان ___ جیسے کوئی فاختہ یا کبوتر پھڑپھڑا رہا ہو ___ مگر اس پھڑپھڑاہٹ میں بھی ...ہتی پھڑپھڑاتی پرچھائیں کا سر ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

وران سب سے پرے

کہیں دور ___ بہت دور کا سفر طے کرتی ہوئی ___ ایک کمزور آواز کی گونج ___"

ع اب کہاں سے قاصدِ فرخندہ پے آئے؟؟

جب جب کبوتر اور فاختہ پھڑپھڑاتی ہے، تاریخ یہ سوال آدمی کے منھ پر مارتی ہے۔

تاریخ کی یہ ضرب اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء سے پھر شروع ہوئی ہے۔

آپ پھڑپھڑاتی ہوئی اس فاختہ کو پہچانتے ہیں ___________ ؟؟؟ ●●

کاشانۂ خلیل

سلطان سُبحانی

رات کا جانے کون سا پہر ہے

میں ابھی ابھی چونک کر اٹھ گیا ہوں۔ اوپر ستارے، کہکشاں ...... اور نیچے آنگن میں اندھیرا اور چارپائی پر میں یعنی خلیل نقاش۔

عمرِ رواں کی آخری سیڑھی تک پہنچی ہوئی شام کا پیڑ کی شاخ پر آخری زرد پتہ۔ یہ میں ہوں۔ ایک جوان بیٹے کا باپ اور یہ چار پائی؟ — ایک مفتوح کائنات زندگی کے طویل ترین جہاد کا شاندار اعزاز۔

میرے بیٹے خالد! میں بہت خوش ہوں۔ اگرچہ اس وقت تم یہاں موجود نہیں ہو لیکن میں تصور میں ہر وقت تمہیں اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور تم سے خیال ہی خیال میں خوب باتیں کرتا ہوں اس طرح مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اور اس دنیا میں ایک چراغ جلایا ہے جس کا نام ہے خالد بن خلیل نقّاش۔ جب بھی تمہیں کوئی اس نام سے پکارتا ہے تو مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ میں اکثر اس اصطبل نما جھونپڑے کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے لکڑی کے یہ سارے تختے اور کھمبے میرے خدمت گار ہیں اور مکڑیوں کے جالے میرے نگراں۔ یہ بڑا سا جھونپڑا تم نے ابھی حال ہی خریدا ہے۔ یہاں تم ایک سہ منزلہ عمارت بنواؤ گے وہ عمارت میں ابھی سے دیکھ رہا ہوں مکمل خوبصورت — کبھی کبھی میں اس چارپائی کے بارے میں بھی سوچتا ہوں کہ یہ ایک ایسی کائنات ہے جس نے زندگی کا بوجھ سنبھال لیا ہے۔ جب بھی میں اس پر موجود ہوتا ہوں تو بیتے ہوئے دنوں کے تمام مناظر، تمام موسم اور تمام واقعات جلوہ نما ہو جاتے ہیں۔ بہت مہرباں اور شفیق ہے یہ چار پائی کہ اس نے زندگی کے پورے ایک

۱۹۳ / ایم۔ ایچ۔ پی کالونی، مالیگاؤں، (ناسک)

[illegible] یہ وہ
چار پائی ہے جس کے دربار میں ماضی کے تمام لمحے خواب پوش شہزادوں کی طرح حاضر ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ ماضی بہت بہترین ذریعہ ہے سانسوں کے اُدھڑے ہوئے پیرہن کو رفو کرنے کا۔ اگر انسان ماضی کو بھول جائے تو اس کی روح تک کنگال ہو جائے گی اور بڑھاپے میں اس کے پاس کوئی بھی ذریعہ نہ رہے گا۔ ذرا سا مسکرانے کا۔ میں خوش ہوں کہ مجھے ماضی کا ایک ایک پل یاد ہے۔

ماضی جو ایک معزول بادشاہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ خالد جب بہت چھوٹا سا تھا تو ایک دن میری بیمار بیوی نے مجھ سے کہا تھا "میں اب بچ نہیں سکوں گی۔ تم خواہ مخواہ میرے علاج پر روپیہ پانی کی طرح ضائع مت کرو بلکہ انھیں سنبھال کر رکھو اور صرف خالد کی تعلیم اور اس دوسری ضروریات پر صرف کرو"۔

اور واقعی وہ بچ نہ سکی۔ شاید وقت سے پہلے مر گئی کیوں کہ اسے یہ احساس مسلسل ہو رہا تھا کہ وہ یوں ہی بستر پر پڑی رہی تو ایک دن گھر کی ساری پونجی اس کے علاج پر ختم ہو جائے گی۔ اور خالد کے لئے یا اس کے مستقبل کے لیے کچھ بھی نہ بچ سکے گا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ احساس شاید اس کائنات میں صرف ماں کو حاصل ہوا ہے ـــ اتنا عظیم احساس اور اسی احساس کے پیش نظر میں نے متاعِ زندگی کے لئے اپنی تگ و دو تیز کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے کچے گھر کی جگہ دو منزلہ عمارت کھڑی ہو گئی "کاشانۂ خلیل"۔

اور اس کے بعد جوں جوں خالد بڑھتا رہا میرا کاروبار بھی بڑھتا گیا۔ میں نے اس کی پرورش یوں کی کہ دیکھنے والی ماؤں کو بھی تعجب ہوا لوگ مثال دینے لگے کہ کوئی باپ ہو تو بس خلیل کی کی طرح۔ میں نے خالد کے لئے اپنی ایک بہت اہم خوشی بھی قربان کر دی۔ ہاں .... کچھ خوشیاں ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کی تکمیل میں حصہ لیتی ہیں۔ خالد کی ماں کے جدا ہونے کے بعد جب میں تنہا ہو گیا تو نجمہ میرے قریب آ گئی بہت قریب شاید اس نے میرے بارے میں کچھ سوچا تھا لیکن خالد کے لئے میں نے اسے مایوس کر دیا۔ ایک دن میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک حرف بھی نہ نکلا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کا پورا وجود چیخ چیخ کر مجھ سے کہہ رہا ہے۔ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا لیکن میں اٹل تھا میں نے وضاحت کی۔

"میں دراصل خالد کو سوتیلی ماں دینا نہیں چاہتا۔"

اس نے بہت زور سے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھیں اب بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان میں کتنا زبردست احتجاج تھا میں شرمندہ ہوا مجھے وہ جملہ کہنا نہیں چاہئے تھا لیکن میں تو خالد کی محبت میں سرشار تھا۔ وہ چلی گئی۔ وہ مجھ سے وہ ایک مہربان پرچھائیں جو شاید قربانی دینے کے لئے میرے قریب آئی تھی۔ جو شائد میری مدد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بے انتہا خوددار تھی۔ میرے سامنے پھر کبھی نہیں آئی۔ مجھے اپنے اندر کچھ ٹوٹنے کا احساس بھی ہوا۔ کچھ کھونے کا ملال بھی ہوا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خالد کے سوا مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی خاطر میں نے تنہا بہت دکھ جھیلے۔ اس کی تعلیم و تربیت پر بہت محنت کی مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنا فرض بہ حسن و خوبی ادا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے خالد جوان ہو گیا۔ یہ میرا خوبصورت گھوڑا، زندگی کی دوڑ میں بہت تیز رفتار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس نے کاروبار میں بھی میرا ہاتھ بٹایا۔ عزت بھی حاصل کی اور میرا نام بھی یوں اونچا کیا کہ لوگ مثال دینے لگے۔ "اگر کوئی لڑکا ہو تو بس خالد کی طرح"۔ میرا سینہ پھیل جاتا اس کی تعریف سن کر۔ مجھے میری تمناؤں کا ثمر مل گیا۔ پھر مجھے فکر ہونے لگی کہ کاشانۂ خلیل میں شادیانے بجیں۔ بے شک ہر باپ کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو۔ میں نے ایک خوبصورت سی .... چاند سی .... پھول سی .... تتلی سی بہو کے خواب دیکھنا شروع کر دئے۔ یہاں تک کہ خواب میں کئی شہزادیاں بھی دیکھ ڈالیں۔ ایک با حوصلہ انسان تھا نا میں تمناؤں کا پورا آسمان۔ بس! کچھ ہی دنوں میں میں نے خوابوں کا انبار لگا دیا اور آخر ایک بہت ہی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی تلاش کر لی۔ لیکن جب ایک حقیقت سامنے آئی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ خالد تو مجھ سے بھی تیز ثابت ہوا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ تو سچ مچ گھوڑا نکلا یعنی اس نے بہت پہلے کوئی لڑکی ڈھونڈلی تھی۔ میں دوسروں کی طرح جز بز نہیں ہوا میری دانست

بن یہ اس کا اس کی اپنی زندگی کی طرف پہلا قدم تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے اپنے معیار کے
طابق خود انتخاب کیا لیکن خالد نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس کی سعادت مندی تھی۔
بں نے کہہ دیا کہ بیٹے! لڑکی اور اس کے خاندان کو دیکھنے کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔

اور جب میں نے لڑکی دیکھی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ
بصورت اور سلیقہ مند نازک سی شرمیلی سی۔ معزز خاندان اور سب سے اہم بات یہ کہ اسکی
ٹھی صرف پانچ سات گلیوں کے فاصلہ پر تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں اُ سے پہلے بھی کئی بار
یکھ چکا ہوں اور بھی میں نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا بھی تھا کہ یہ مجھے دیکھ کر فوراً
دوپٹہ ٹھیک کر کے سر کیوں جھکا لیتی ہے سہم جاتی ہے یا میرا احترام کرتی ہے؟ تو سارا معاملہ
ب سمجھ میں آیا۔ واہ بیٹے خالد! تم نے کمال کر دیا۔ اس گھر کے لئے کوئی فیشن ایبل نہیں بلکہ
ب باشعور اور خوب سیرت بہو کا انتخاب کیا۔ میں نے انتہا خوش قسمت باپ ہوں۔ کاش
ہاری ماں یہ سب دیکھ سکتی۔ ممکن ہے کہیں نہ کہیں سے دیکھ رہی ہو۔۔۔ کسی لمحے کے
یچھے سے ـــــ گھر کے سامنے کھڑے ہوئے انجیر کے پتوں کی اوٹ سے ــــ گھر کے برتنوں
درمیان سے ــــ یا دیوار پر آویزاں کسی بھی طغرے کے قریب سے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
سُبحَان العَالِمِ الغَیب۔

اوہ! میری آنکھیں بھیگ کیوں گئیں؟ دل میں ایک عجیب سی لہر دوڑنے لگی ہے
ردی زیادہ ہے شاید اس لئے رات کافی بیت چکی ہے۔ میں یہ کمبل اوڑھ لیتا ہوں لو
لتاں اور بھی نکھر گئی ہے۔ بہت دور سے ڈھولک کی آواز آ رہی ہے۔ شاید کہیں رتجگا ہے
ے چارپائی، تو نے کبھی رت جگا دیکھا؟ میں زور سے ہنس پڑتا ہوں۔ کھانسی آجاتی ہے
ھاپے کی ہنسی اور کھانسی میں کتنا کم فاصلہ ہوتا ہے۔ شاید صبح ابھی کافی دور ہے اے میری
شفیق چارپائی۔ یہ غلیل نقاش ہمیشہ دوڑنے والا انسان آج شاید بہت تھک کر تیری
ہ میں آگیا ہے اور اس کی ہر سانس ماضی کا پیرہن بننے لگی ہے۔ اب کام کچھ بھی نہیں رہا
ا کے سوا اور کھانسنے کے سوا۔ لیکن ماضی کا انداز کتنا شاہانہ ہوتا ہے محو کر دیتا ہے ہاتھ
ڑ کر کھینچ لیتا ہے حال کی سیڑھیوں سے۔

وہ دن کتنا خوبصورت تھا جب کاشانۂ خلیل پھولوں اور قمقموں سے سج دھج گیا۔ آتش بازیوں سے بے شمار گلیاں منور ہو گئیں اور جب گھر میں بہو نے قدم رکھا تو خوشیوں کا سیلاب آ گیا۔ پورا جگمگا اٹھا۔ خالد کی ماں کے جدا ہونے کے بعد جو ایک عجیب سی ویرانی و بے اطمینانی تھی، دور ہو گئی۔ بہت سارے لوگوں نے مبارکباد دی۔ میرا پورا وجود صرف آنکھوں میں آ گیا اور خوشیوں سے جھوم اٹھا۔

خالد کی شادی کے بعد میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ساری فکر دور ہو گئی تھی۔ بہت مزے کی نیند آنے لگی۔ ایک دن خالد نے مجھ سے کہا۔

"ابو آپ نے زندگی بھر بہت محنت کی ہے۔ اب آپ آرام کیجئے۔ آپ کے سارے کام میں کروں گا۔"

میں نے کہا "بیٹے مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں واقعی شل ہو رہے ہیں۔ اب مجھ سے اتنی بھاگ دوڑ نہیں ہوتی۔"

تو ٹھیک ہے ابو! خالد نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے"

اور خالد نے کاروبار سنبھال لیا۔ مجھے انتہا خوشی ہوئی کہ اسے میری زندگی کی محنتوں کا احساس ہے اور میرے آرام کا خیال بھی۔ میں گھر پر کافی وقت آرام کرنے لگا۔ ایک سال پورا گذر گیا۔ گھر میں پھر خوشیوں کا سیلاب آ گیا۔ خالد ایک چاند سے بچے کا باپ بن گیا اور میں دادا۔ اس رات میں خوشیوں کی وجہ سے سو نہیں سکا مسکراتا رہا۔ کاشانۂ خلیل رات بھر منور رہا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے کاشانۂ خلیل کو نور سے منور کیا۔ ہاں میں نے اس بچے کا نام اپنی پسند سے خورشید رکھا۔ خلیل... خالد اور خورشید۔۔۔ ان تینوں ناموں کے درمیان ایک خوشگوار سی مماثلت، ایک گہرا ایک رشتہ اور ایک دل پذیر رابطہ محسوس ہوا سب نے نام کو بہت پسند کیا۔ بہو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس سے اچھا نام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ میرے بیٹے کی طرح بہو بھی بے انتہا سمجھ دار اور فرماں بردار ہے۔ اتنی نیک دل بہو کیسے ملتی ہے آج کل۔ واقعی خدا مجھ پر بہت مہربان ہے۔

تکمیل

میرا پورا وقت خورشید کے ساتھ کٹنے لگا۔ اس کی پرورش بھی میری گود میں ہونے لگی۔ خالد تو کاروبار میں بے انتہا مصروف رہتا اور بہو گھر کے کاموں میں۔ لہٰذا خورشید کی پرورش کے لئے مجھ سے بہتر اور کوئی نہیں تھا اور یوں بھی مجھے کوئی دوسرا کام نہ تھا اس کے ساتھ میرا وقت بھی بہت مزے سے گذرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خورشید پاؤں پاؤں چلنے لگا۔ خالد کی طرح اِسے بھی چلنا میں نے سکھایا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا بیٹا کتنی جلدی چلنے لگا ہے۔ تعجب بھی ہوا ــــ اور پھر میں نے اسے بولنا بھی سکھا دیا۔

ایک دن بہو مجھ سے کہنے لگی۔

" ابو اس کا نام خورشید تو ٹھیک ہے مگر میں نے سنا ہے کہ اس نام کا اثر اچھا نہیں ہوتا بڑا ہو کر یہ بہت غصے ور نکلے گا۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ اس کا نام شہزاد رکھ دیا جائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ....."

میں چونک گیا۔ یوں لگا جیسے ہاتھ سے تسبیح گر گئی ہو۔ انگلیوں میں کپکپاہٹ ہونے لگی لیکن میں نے اپنی کیفیت فوراً سنبھال لی۔

بہو تمہیں پورا اختیار ہے نام بدلنے کا' اور شہزاد تو بہت ہی اچھا نام ہے خوبصورت باوقار... عالی شان' ۔ وہ خوش ہو گئی۔

اور میرا پوتا خورشید شہزاد میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے سوچا ممکن ہے خالد اس نام پر اختلاف ظاہر کرے مگر اسکے جانب سے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا ہاں' وہ اسی دن سے خورشید کو شہزاد کے نام سے پکارنے لگا "بیٹے شہزاد اِدھر آؤ! ــــ بیٹے شہزاد! دیکھو ہم تمہارے لئے کیا لائے ہیں...."

میں خود بھی اِسے شہزاد کہنے لگا اور یہ سوچ کر میں نے خود کو مطمئن کر لیا کہ وہ اس بچے کے ماں باپ ہیں۔ انھیں اپنی پسند کا نام رکھنے کا پورا حق ہے اور میں تو وہ شخص ہوں کہ خالد کو خوش دیکھنے کے لئے میں نے نجمہ کو بھی ٹھکرا دیا۔ نام تو ایک بہت معمولی شئے ہے۔ اس کا درجہ میرے بیٹے یا بہو سے بلند ہرگز نہیں۔ ان پر ایسے ایسے سینکڑوں نام قربان

لیکن اسکے فوراً بعد ہی مجھے ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔ بہو نے میرے دسترخوان کی جگہ تبدیل

ڈسی۔ یعنی روشنی سے ملحق کمرے کی بجائے اس نے میرا دستر خوان ایک دالان کے
لگادیا۔ میں نے پوچھا۔
"بہو تم نے میرا کھانا اس کمرے میں کیوں لگایا؟"
وہ ہنس کر بولی۔ "ابو پچھلے کمرے میں بہت گھٹن رہتی ہے نا اس لیے۔ یہاں آپ
اطمینان سے بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔
ٹھیک ہی تو ہے۔ میں نے سوچا۔ بہو مجھے باپ کی طرح سمجھتی ہے۔ اسے میرا کتنا خیال ہے
پھر ایک دن خالد مجھ سے نہایت محبت بھرے انداز میں کہنے لگا۔
" ابو۔۔۔ آپ سے ایک بات کی اجازت لینا چاہتا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "بیٹے، اب تم خود ایک بچے کے باپ بن چکے ہو۔ تمھیں ہر طرح کا
پورا اختیار ہے کچھ کرنے کے لئے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے علم ہے کہ تم
کوئی غلط کام نہیں کروگے۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔"
خالد خوش ہو گیا۔ "ابو بات یہ ہے کہ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔۔ دیکھئے نا شہزاد رات
میں ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتا۔۔۔۔ آپ کھانستے بہت ہیں نا۔۔۔۔ اس لیے۔"
"ہاں بیٹے۔ مجھے بہت کھانسی آتی ہے۔ لیکن کیا کروں یہ عمر ہی ایسی ہے۔"
"تو ابا۔۔۔۔" خالد نے رک رک کر کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ۔۔۔۔ آپ کا بستر باہر
دالان میں۔۔۔۔۔ لگادیا جائے۔"
"دالان میں؟"
"ہاں اگر۔۔۔۔ آپ اجازت دیں تو۔۔۔۔۔ سردی وغیرہ کے لئے آپ کو رضائی
اور کمبل دے دیا جائے گا۔"
میں نے خالد کے چہرے کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ تھوڑا جھجکا لیکن اس کے چہرے
پر بلا کی سعادتمندی تھی۔ کچھ لمحے سوچ کر میں نے کہا۔ "بیٹے میں یہ چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے
تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو تم بہ خوشی وہاں میرا بستر لگوا سکتے ہو۔ یہ صحیح ہے کہ میری کھانسی نیند
میں خلل ڈالتی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس گھر میں ہر فرد کو میٹھی نیند آئے۔"

اس نے خوش ہو کر کہا۔ "ابو آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے"۔

میں مسکرانے لگا میں نے دل میں کہا۔ بیٹا میں تمہارے لئے تو جان بھی دے سکتا ہوں"۔

اس شب جب میرا بستر دالان میں لگا تو شہزاد نے معصومیت سے تڑپ کے احتجاج کیا۔

دادا جان آپ کا بستر یہاں کیوں ہے۔ آپ یہاں سوئیں گے تو مجھے کہانی کون سنائے گا؟

" بیٹے، کہانی میں تمہیں ضرور سنایا کروں گا۔"

" نہیں آپ بہانہ کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہاں سونے نہیں دوں گا آپ اندر بستر لے چلئے"

بہو نے چیخ کر کہا "شہزاد! ـــ بدتمیزی کر رہا ہے دادا سے میں سناؤں گی تمہیں کہانی"

" نہیں نہیں! ـــ میں دادا جان سے سنوں گا۔"

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "شہزاد، تمہاری امی کو بہت اچھی اچھی کہانیاں یاد ہیں۔ بے شمار کہانیاں انھیں سن کر تم خوش ہو جاؤ گے۔"

" نہیں، امی کی کہانیاں تو لالو ددکان والے کے بتاخوں کی طرح ٹھس ہیں۔"

" کیا کہہ رہا ہے رے تو؟ ـــ ٹھہر جا آنے دے تیرے ابا کو" بہو اسے کھینچ کر اندر لے گئی

خالد ان دنوں کاروبار میں کافی الجھا ہوا تھا لیکن اسے مارکیٹ میں میرا نام روشن کر دیا تھا۔ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ میں اس کی ہوشمندی اور قابلیت سے بے حد خوش تھا اس کے لیے دعائیں کرتا کہ خدا اسے نعمتوں اور ترقیوں سے اور نوازے اتنا کہ وہ پورے مارکیٹ پر چھا جائے۔

بہو کافی صحت مند ہو چلی تھی گول مٹول۔ رنگ اور نکھر آیا تھا۔ میں سوچتا واقعی لاکھوں میں ایک ہے میری بہو۔ اولاد ہونے کے بعد تھوڑا چڑ چڑا پن آجاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ خالد سے کئی بار الجھ چکی ہے لیکن اس نے آج تک مجھ سے کوئی گستاخی نہیں کی۔ کافی ادب کرتی ہے میرا۔

میں اکثر صبح سویرے شہزاد کو پارک لے جاتا۔ بڑا لطف آتا۔ گھاس تلیاں

پھول، چھوٹے، رنگ برنگے لباس میں کھیلتے ہوئے بچے۔ شہزاد کے ساتھ میں بھی کھیلنے لگ
جاتا۔ دوسرے بچے دیکھ کر خوب ہنستے۔ پھر کافی وقت گزارنے کے بعد ہم پارک سے قریب ایک
ریسٹورنٹ میں جاتے۔ میں چائے پیتا اور شہزاد چاکلیٹ کھاتا۔ پھر ہم خوش خوش گھر واپس ہوتے۔
ایک دن جب ہم پارک سے واپس ہوتے تو گھر کے سامنے انجیر کے پیڑ کے قریب پہنچتے
ہی میرے قدم ٹھٹھک کر رک گئے۔ دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ شہزاد نے دو اجنبی لوگوں
کو دوسرے منزلہ پر دیکھ کر کہا۔
"دادا جان وہ کون لوگ ہیں اور وہاں اوپر چڑھ کر کیا کر رہے ہیں؟"
"بیٹے ــــ وہ اپنے گھر کا نام "کاشانۂ خلیل" کھرچ کر "کاشانۂ خالد" لکھ
رہے ہیں۔"
"کیوں؟ ابّا انھیں منع کیوں نہیں کر رہے ہیں۔"
"مجھے نہیں معلوم بیٹے۔"
مجھے دیکھ کر خالد لپک کر قریب آیا اور اس نے نہایت متانت سے کہا۔
"ابّو ایک مسئلہ ایسا آن پڑا کہ اس گھر کا نام تبدیل کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔"
"کون سا مسئلہ؟"
اچانک بہو سامنے آ گئی اور اس نے خالد سے کہا۔ "ارے! آپ ابھی تک مارکیٹ
نہیں گئے؟ دیکھئے دس بج رہے ہیں۔"
"او ہاں۔"
خالد یوں ہی چھوڑ کر مارکیٹ چلا گیا۔
بہو مجھ سے کہنے لگی۔ "ابّو آپ کافی تھک گئے ہوں گے۔ آپ کے لئے چائے بناؤں؟"
"چائے ــــ؟ ہاں میں واقعی کچھ تھک گیا ہوں۔"
میں دن بھر کچھ سوچتا رہا۔ پھر رات میں جب خالد واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔
"خالد تم سوچ رہے ہو گے کہ اس گھر کی شناخت تبدیل کرنے پر مجھے کوئی اعتراض
ہوا ہو گا۔ نہیں بیٹے، یہ گھر تمھارا اور بہو کا ہے اور شہزاد کا بھی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں
تھا۔

۔ کہ ہر شئے پہ تمہیں پورا اختیار ہے کیونکہ تم میرے ایک ہی بیٹے ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اندر خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ یقیناً تم آگے بھی ہر قدم پر کامیاب رہو گے۔ میرا سفر تو اب تقریباً ختم ہے۔ پتہ نہیں کب آنکھ بند ہو جائے۔"

"نہیں ابو، ایسا نہ کہئے پلیز۔ خدا کرے آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر قائم رہے۔"

اور کچھ دنوں کے بعد بہو نے مجھ سے کہا۔

"ابو! شہزاد کے ابا نے یہاں سے قریب ہی ایک بہت بڑا جھونپڑا خرید لیا ہے۔ بے حد سستا۔ کچھ عرصہ بعد وہ وہاں ایک سہ منزلہ عمارت بنانے والے ہیں، مگر اس جھونپڑے کی دیکھ ریکھ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہاں دوکان کا کچھ سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہیں وقت گذارا کیجئے میں آپ کا کھانا بھجوا دیا کروں گی۔"

شہزاد بول اٹھا۔ "نہیں، میرے دادا وہاں نہیں جائیں گے۔ وہاں گھوڑے مرتے ہیں۔" بہو نے گھور کر اسے دیکھا۔ "بڑوں کے بیچ میں بولتا ہے بہت بدتمیز ہو گیا ہے تو۔ وہ پہلے کبھی اصطبل تھا، اب نہیں۔ اب تو وہ بہت ہی قیمتی زمین ہے وہاں اپنی بہت بڑی عمارت بنے گی۔"

میں نے کچھ سوچ کر بہو سے کہا۔ "تو ٹھیک ہے بہو۔ میرا بستر وغیرہ وہاں بھجوا دو میں یوں بھی بے کار پڑا رہتا ہوں۔ کم از کم وہاں کی نگرانی ہی کیا کروں گا۔ پتہ نہیں کیوں آجکل مجھے کھانسی کچھ زیادہ ہی آ رہی ہے۔ ممکن ہے وہاں کی کھلی ہوا، فضا میں کچھ کم ہو جائے۔"

اور میرے شب و روز اس جھونپڑے میں سمٹ آئے۔

شہزاد مجھ سے ملنے روزانہ آتا ہے۔ کبھی کبھی میں بھی وہاں چلا جاتا ہوں اور کبھی کبھی خالد اور بہو بھی ادھر آ جاتے ہیں۔ مجھ سے بڑی محبت سے پوچھتے ہیں۔

"ابو! آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔؟"

میں سوچتا ہوں۔ مجھے کیا تکلیف ہے۔ بے انتہا آرام ہے اس چار پائی پر۔ کھانا بھی وقت پر مل جاتا ہے۔ کپڑے بھی دھل کر آ جاتے ہیں۔ بیٹے میں نے تمہیں کبھی اداس، پریشان یا فکر مند نہیں دیکھا۔ یہ میری فتح ہے میری خوش بختی ہے۔ ایک باپ کی تکمیل

اس سے زیادہ خوشی باپ کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی زندگی میں اس کا بیٹا کبھی افسردہ نہیں ہوا۔

رات شاید اپنی آخری سرحد تک پہنچ چکی ہے۔ ڈھولک کی آواز بند ہو گئی ہے ابھی کچھ دیر بعد سائرن کی آواز آئے گی اور بہت سارے گھروں میں روشنیاں ہو جائیں گی چارپائی کچھ سرد ہو گئی ہے۔

اور میں خلیل نقاش، اپنے ماضی کے تمام جنازے سے گھوم کر واپس آ گیا ہوں۔ کامیاب و کامران کیوں کہ میں اپنی محبت اور اپنے فرائض میں ثابت قدم رہا ہوں۔ میرے بیٹے خالد! میں تمہاری راہ میں کہیں بھی حائل نہیں ہوا۔ زندگی کی جد و جہد میں میں نے تمہیں پورا اعتماد دیا۔ تمہارے اعتماد کو تقویت بخشی۔ میں تمہاری تیز رفتاری پر خوش ہوں میرے گھوڑے اگر میں اس اصطبل میں آ گیا تو کیا ہوا۔ تم یہاں ایک سہ منزلہ عمارت کھڑی کرو گے۔ مجھے تمہاری ہوشمندی پر ناز ہے۔ مجھے اگر تم سے کوئی شکایت ہے تو صرف اتنی کہ تم نے اپنی مرحوم ماں کو کبھی یاد نہیں کیا۔ جو تمہارے لئے وقت سے پہلے مر گئی۔ میرے بیٹے اگر تم نے "کاشانۂ خلیل" کو کھرچ کر تبدیل کر دیا تو کیا ہوا، تم نے اپنے جسم کا خون تو تبدیل نہیں کیا۔ کر بھی نہیں سکتے۔ جو اول تا آخر میرا ہے۔ خالد میرے بیٹے! تمہیں اور بہو کو میرے آرام کا خیال ضرور رہا ہے گھر سے دالان اور دالان سے یہاں میں کہیں بھی فکرمند نہیں ہوا، مجھے کسی بات کا دکھ نہیں ہے لیکن بیٹے مجھے تمہارے آنے والے دنوں کا صدمہ ہے۔ تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔ کیونکہ اس معرکۂ زندگی میں شہزاد ایک باغی اور حقیقت پسند سپاہی بن کر نمودار ہوا ہے اور تیزی سے بڑھ رہا ہے کیا تم نے اس کے تیور نہیں دیکھے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن وہ "کاشانۂ خالد" کو کھرچ کر اپنا نام لکھ دے اور تمہیں اس مفتوح کائنات کے حوالے کر دے جس کا دوسرا نام ہے چارپائی۔

میرے لختِ جگر ـــ یہ خلیل نقاش تو اس وقت سے خوفزدہ ہے جو شہزاد کے اندر ایک بے تاب شعلہ کی طرح ابھی سے گھوم رہا ہے

کالی کرن

مشتاق رضا

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے جمنا کو پکارا کہ آ کر خالی برتن سمیٹ لے وہ شاید کچن میں مصروف تھی اُس نے وہیں سے ہانک لگائی۔

"ابھی آتی ہوں بابو جی۔"

میں نے میز پر رکھے ہوئے اخبار کی تہیں کھولیں اور سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا خبریں پرانی ہی تھیں فقط لفظوں کی ترتیب نئی تھی۔ وہی فسادات، دہشت انگیزی، خودسوزی، عصمت دری، سیلاب اور حادثات سے متعلق خبریں تھیں۔ نئی پرانی فلموں کے اشتہارات سے پورا ایک صفحہ بھرا ہوا تھا۔ ہمارے اردو اخبارات میں سوائے اِس کے ہوتا بھی کیا ہے۔ میں نے بےزاری سے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ سامنے جمنا میز سے برتن سمیٹ کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی وہ شاید میری محویت کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھی ...... مجھے اچھا لگا۔ فرحت ہوتی تو اُسے میری محویت کی پرواہ نہ ہوتی۔ وہ بیچ ہی میں مجھے ٹوک دیتی یا اخبار ہی ہاتھ سے چھین لیتی اور سمجھتی کہ اُسے اس کا حق ہے کیوں کہ وہ بیوی ہے مگر جمنا تو بہرحال خادمہ تھی۔

کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتی ہو؟

"بابو جی وہ مجھے ...."

"روپوں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں مجھے چھٹی چاہیے۔"

"کیوں فلم و لم کا پروگرام ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ جمنا مہینے بھر میں ایک بار فلم دیکھنے کے لیے مجھ سے چھٹی لیا کرتی ہے۔

"نہیں بابو جی اب کے مجھے لمبی چھٹی چاہیے ایک ڈیڑھ مہینے کی۔"

ایک دیڑھ مہینے کی؟...... مگر عبداللہ ملباری کے ہوٹل کے بدمزہ اور واہیات کھانے میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے جنہیں ہفتوں زہر مار کرتا رہا تھا اور پھر سیویئر ڈسینٹری میں مبتلا ہو کر ہاسپٹل میں ایڈمٹ بھی رہا تھا۔

"ہاں بابوجی گاؤں جاؤں گی...... میری چھوکری کی زچگی ہونے والی ہے۔ اُسے میری ضرورت ہوگی۔" اُس کے لہجے میں ممتا تھی...... پیار تھا جسے میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"ٹھیک ہے تم ضرور جاؤ لیکن......"

بابوجی آپ فکر نہ کریں: میں نے مریم سے بات کر لی ہے۔ میرے ہی گاؤں کی ہے۔ ایماندار اور محنتی بھی ہے..... کھانا تو اتنا بڑھیا پکاتی ہے کہ آپ...... بابوجی وہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ جمنا نے اپنے جانے کا راستہ مزید ہموار کر لیا۔

"کب جا رہی ہو؟"

"پہلے اُسے لے آؤں گی، چولہا چوکی کے بارے میں سمجھاؤں گی پھر پرسوں چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم جلد آنے کی کوشش کرنا۔" میں نے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا...... ابھی پچھلے ہفتے تو آپ تنخواہ دے چکے ہیں۔"

"رکھ لو سفر میں کام آئیں گے...... اور ہاں میری طرف سے اپنے ہونے والے نواسے یا نواسی کے لیے ایک سوٹ بھی لے لینا۔" میں نے سو روپیوں میں پچاس کے نوٹ کا اضافہ کیا۔ اُس کے آنکھوں میں نمی چھلک اُٹھی نوٹ لے کر اُس نے اُنہیں چوما اور اپنی آنکھوں اور ماتھے سے لگا کر ساڑی کے آنچل میں باندھ دیا۔ یہ اُس کی طرف سے ایک طرح کا اظہارِ تشکر تھا اچھا بابوجی، وہ جانے کے لئے مڑی۔

"اچھا...... لیکن تم جلد آنے کی کوشش کرنا۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی اور مجھے آنے والے کل کی فکروں میں غلطاں چھوڑ گئی۔ کون جانے نئی خادمہ ٹک کر ہو بھی یا نہیں۔ جمنا نے تو گھر کو اس انداز میں سنبھال لیا تھا جیسے وہ اِسی گھر کی ایک فرد ہو۔ اگر فرحت ذرا سی بات پر روٹھ کر میکے میں نہ جا بیٹھتی تو مجھے آج کسی بات کی پریشانی نہ ہوتی...... مگر اُسے تو اپنے

باپ کی دولت کا زعم تھا۔۔۔۔۔۔ بیوی کے تعلق سے میرا آئیڈیل صرف اتنا ہی تھا کہ لڑکی قبول صورت اور پڑھی لکھی ہو اس لیے کہ میرے ذوقِ نظر اور حسن پرستی کے جذبے کی تسکین ہو سکے اور پڑھی لکھی اس لیے کہ باشعور اور سمجھ دار ہو تاکہ ہونے والے بچوں کی صحیح ڈھنگ سے پرورش ہو سکے۔ فرحت قبول صورت بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی مگر تعلیم نے اُس کے ذہن کو وہ جلا نہیں بخشی تھی کہ وہ میرے اندھیرے گھر کو روشن کر سکتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شادی کے بعد کے چند مہینے میری ازدواجی زندگی کے پُر بہار اور خوشگوار ترین لمحات تھے جنہیں میں زندگی کے کسی حصے میں فراموش نہیں کر پاؤں گا۔ میں اُس وقت خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین اِنسان سمجھتا تھا۔۔۔۔ سینوں میں جذبات سے بھرپور دل تھے۔ جوش تھا اُمنگ تھی، جوانی کی ترنگ تھی۔ آنکھوں میں خوش کن تمناؤں کے سپنے تھے۔ ہم ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے زندگی کی راہوں پر آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ فضائیں گنگناتی رہیں۔ موسم گل رنگینیاں بکھیرتا رہا خوشبوئیں لٹاتا رہا۔ چاندنی اپنی آغوش میں ہمیں جھلاتی رہی نکہت باد بہاری تھپکیاں دیتی رہی، لوریاں گاتی رہی۔ عشق و محبت کے جذبات کا دھارا تھا جو ہمارے وجود کو لہروں کے دوش پر بہائے لیے جا رہا تھا۔۔۔۔ وہ لمحہ میرے لیے کس قدر جان لیوا تھا میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی چاندنی میں ڈوبے ہوئے سحر کن ماحول میں تاج محل کے سامنے جب فرحت نے میرے ہاتھوں کو تھام کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا اور میں نے شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اُسے اپنی آغوش میں اتنی زور سے بھینچ لیا تھا کہ اُس کا دم لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا اور اُس کی گردن میرے شانے پر ڈھلک گئی تھی۔

اُف وہ لمحہ ۔۔۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر میرے دل کو مسل دیا ہو تڑپ کر میں نے اُسے پکارا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لانبی لانبی پلکوں کے سائے رخسار پر اُتر آتے تھے۔ نیم وا ہونٹوں سے جھانکتے موتی کی طرح دانت ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔

"فرحت۔۔۔۔۔ فرحت آنکھیں کھولو فرحت۔۔۔۔ میری طرف دیکھو" میری آواز کانپ گئی تھی پھر اُس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ میری جان میں جان آئی تھی۔

"کیا ہوا تھا فرؔ و ۔۔۔۔۔ تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔

وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔ بڑی دلفریب تھی اُس کی وہ مسکراہٹ اور میں نے جھک کر اُس کے تبسم بھرے ہونٹوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر وقت کی کمزور پڑتی گرفت سے لمحات پھسلتے چلے گئے تھے۔ بینک سے ملی تعطیلات کے ختم ہونے میں چند دن رہ گئے تھے۔ روپے بھی ختم ہونے کے قریب تھے۔ ہم لوٹ آئے۔ کچھ ہی دنوں بعد مینجمینٹ سے مجھے ٹرانسفر کا آرڈر ملا۔ پی۔ آر۔ او۔ کی حیثیت سے میرا تبادلہ دوسرے شہر میں کیا گیا تھا۔ نئی جگہ تھی اجنبی لوگ تھے۔ رہائش کا انتظام مجھے اپنے طور پر کرنا تھا۔ زیورات پر لون اٹھا کر میں نے چھوٹا سا مکان کرایے پر حاصل کر لیا پھر قسط وار قرض کی ادائیگی اور آسمان کو چھوتی ہوئی مہنگائی نے صبر آزما حالات سے دو چار کر دیا ہمیشہ ساتھ نبھانے اور سکھ دکھ میں شریک رہنے کا عہد متزلزل ہو کر رہ گیا۔ محدود آمدنی میں امپورٹیڈ ساڑیوں اور آرائش و زیبائش کی مصنوعات کی خریداری کی گنجائش۔ رہی تو فرحت کے مزاج کا کھلنڈرا پن چڑچڑے پن سے بدل گیا۔ مگر مم حالات کی کمزور ساعتوں میں اُس کی محبت موم کی طرح پگھل گئی ہم اُس نے بات بے بات پر الجھنا شروع کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرحت جو کبھی میرے لیے راحت جاں تھی عذاب جاں بن گئی اُس کے ہمہ وقت پھولے ہوئے چہرے کڑوے کسیلے اور طنز آمیز لہجے سے مجھے کوفت ہونے لگی۔

"آخر ہم بنیوں کی طرح کب تک ناپ تول کر زندگی بسر کرتے رہیں گے؟"

" قرض کے ادا ہونے تک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔"

"اُس کے بعد نئی الجھنیں پیدا ہوں گی نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

" فرحت تم ساتھ دو تو ہم ہر الجھن کو سلجھا لیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر مسئلہ ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔

" تم ڈیڈی سے مدد کیوں نہیں لیتے۔"

" یہ مجھے گوارا نہیں ہے"

" ترک کر دو تمہاری یہ غیر ضروری خودداری۔"

" دیکھو فرحت ان حالات میں بھی میں تمہیں بھوکوں تو نہیں مار رہا ہوں۔ تم اپنے غیر ضروری تقاضے بند کر دو۔ سر دست، ہماری پریشانیوں کا یہی حل ہے۔"

"تم میری ذمہ داریاں اٹھا نہیں سکتے تو مجھے میکے میں چھوڑ آؤ۔"
"ذمہ داریاں کیوں نہیں اٹھا سکتا۔۔۔۔۔ہاں تمہاری بے جا ناز برداریاں نہیں سہہ سکتا"
"تو مجھے جانے دو۔"
"کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔"
"میں بچوں کی سی باتیں کرتی ہوں یعنی تم چاہتے ہو کہ میں اپنی آرزو دوں اور چاہتوں کا گلا گھونٹ کر ہمہ وقت تمہارے ساتھ چپکی رہوں تب تم مجھے سنجیدہ سمجھدار اور وفا شعار مانو گے۔"
"اور تم چاہتی ہو کہ تمہیں پانے کے لیے مچلوں اور میں اسے آسمان سے نوچ کر تمہارے دامن میں ڈال دوں۔"
"ہنہ۔۔۔۔۔زمین کی چیزیں تو دے نہیں سکتے اور آسمان کی باتیں کرتے ہو" اس نے بڑی حقارت سے کہا۔ اس کے لہجے میں چھپا نشتر میرے دل کو چیرتا چلا گیا اور میں تڑپ اٹھا۔
"فرحت" میرا لہجہ تیز تھا۔
"چیخو مت۔۔۔۔۔۔۔ چیخنے چلانے سے حقیقتیں بدلا نہیں کرتی ہیں۔"
"آخر تم چاہتی کیا ہو" میرا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا تھا۔
"مجھے اپنے ڈیڈی کے پاس جانے دو۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری اجازت کا سوال کہاں اٹھتا ہے جو تمہارے جی میں آئے کر گزرو۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔"
اسی شام کو وہ اپنا سامان پیک کر کے چلی گئی۔۔۔۔۔اسے اپنے باپ کی دولت کا زعم تھا اور مجھے اپنی انا اور خودداری کا۔ زندگی کا سونا پن لوٹ آیا تھا شعور کے نہاں خانوں میں تنہائی کے احساس کا کرب جاگ اٹھا تھا۔ دو چار دنوں تک تو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے فرحت مجھے چھوڑ کر کہیں گئی نہیں ہے بلکہ میرے آس پاس موجود ہے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی لگتا جیسے وہ سامنے صوفے پر بیٹھی سوئٹر بن رہی ہو یا کچن میں کوئی کام کر رہی ہو۔۔۔۔رفتہ رفتہ میں پھر سے اکیلے پن کا عادی ہو گیا۔ زندگی کی بے اعتدالیاں لوٹ آئیں۔ بیڈ شیٹ جو روزانہ بدلی جاتی تھی اب ہفتوں اسی طرح میلی کچیلی شکن آلود رہنے لگی گندے کپڑے بکھرے رہنے لگے

شوکیس پر گرد کی تہیں جمنے لگیں اور فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے پڑے دکھائی دینے لگے ۔۔۔ میرا وجود میری ہی ذات میں بکھرتا چلا گیا تھا۔ ہوٹل کے کھانوں نے مجھے پیٹ کے عارضوں میں مبتلا کر دیا اور آخر ایک دن مجھے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔ اس بیچ نہ فرحت نے میری خبر گیری کی کوشش کی اور نہ ہی میں نے اس سے کوئی رابطہ قائم کیا ۔۔۔۔ اس کے [illegible] ایک دوست کے کہنے پر میں نے جمنا کو کھانا پکانے کے لیے رکھا پھر گھر کے سارے کام وہی کرنے لگی اور میری پریشانیاں بڑی حد تک کم ہوتیں ۔۔۔۔ آج وہ طویل مدت کے لیے رخصت پر جا رہی تھی۔

کلاک نے دس بجائے اور میں چونک پڑا۔ میز سے اٹھ کر میں نے بینک جانے کی تیاری کی پھر ضروری فائلیں لے کر گھر سے نکل پڑا۔

دوسرے دن ابھی میں سو کر اٹھا نہیں تھا کہ جمنا آ گئی ویسے بھی جمنا کے آنے کے بعد ہی میری صبح کا آغاز ہوتا تھا وہ صبح سویرے آ کر مجھے جگاتی اور ناشتہ کی تیاری میں لگ جاتی میرے نہا دھو کر فراغت حاصل کرنے تک ناشتہ میز پر سج جایا کرتا تھا آج جمنا اپنے ساتھ مریم کو لے آئی تھی۔ میں معمول کے مطابق تیار ہو کر ناشتہ کی میز پر جا بیٹھا تو جمنا اسے لیے میرے سامنے آئی

"بابو جی میں اسے لے آئی ہوں سارا کام سمجھا دیا ہے۔"

"ہوں" میں نے مریم کے سراپے پر نظر ڈالی۔ بوسیدہ ساڑھی میں ملبوس ادھیڑ عمر کی عورت مجھے ایسی نظر سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں میں اسے ملازمت دینے سے انکار نہ کر دوں

"ٹھیک ہے جمنا کے آنے تک اچھی طرح کام سنبھال لو۔"

"بے فکر رہیے مالک" اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ جمنا مجھ سے اجازت لے کر چلی گئی۔ میں بینک کے لیے نکل پڑا۔ اس رات میں نے مریم کے ہاتھوں کا پکا کھانا کھایا جو واقعی لذیذ تھا مجھے اس کی طرف سے اطمینان ہوا۔

ناشتہ کی میز پر جب مریم پلیٹیں سجانے لگی تب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا چہرہ جانا پہچانا ہو۔ میں نے اپنی یاد داشت کو کھنگالا' کافی دیر تک سوچتا رہا اس کے چہرے میں بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اسے یاد رکھا جا سکے پھر مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے میں نے

اُسے کہیں دیکھا ہو۔" مریم تم اِس شہر میں آنے سے پہلے ...."

"جی مالک میں یہاں کی نہیں ہوں" اس نے بات بیچ ہی میں اُچک لی۔

"پھر ؟"

"میں کلیانی کی ہوں"۔

"کلیانی ...." مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

"حافظ شاہ بابا کی درگاہ کے سامنے فٹ پاتھ پر بنی کٹیا میں"۔

"جی مالک"

"تمہارا آدمی ہاتھ گاڑی کھینچتا تھا" ......

"جی مالک آپ تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں"۔ اُس کے لہجے میں خوشی و حیرت کی آمیزش تھی۔

"ہوں .... میں نے اُس شہر میں اپنی زندگی کے کچھ دن گزارے ہیں"۔

وہ کچن میں چلی گئی اور میں سوچتا رہا۔ چند برسوں پہلے اِس عورت کو میں نے بارہا دیکھا تھا۔ شاید روزانہ .... جب سورج غروب ہو جاتا اور سُرمئی غبار کا آنچل فضائے بسیط پر لہرانے لگتا تو میں دوستوں کی محفل سے اُٹھ کر گھر کی طرف چل دیتا۔ راستے میں مریم کی کٹیا کے قریب چیخ پکار گالی گلوج اور مار پیٹ کا طوفان بدتمیزی بپا ہوتا۔ تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں جہاں تفریح کے ذرائع محدود ہوتے ہیں وہاں لوگ دوسروں کے جھگڑوں میں اپنے لیے تفریح کا سامان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مریم کا شوہر نشے میں دُھت اُسے پیٹ رہا ہوتا یا بال پکڑ کر گھسیٹ رہا ہوتا یا پھر منہ سے کف اُڑاتا اُسے گندی گندی گالیاں دے رہا ہوتا۔ مریم آنکھوں سے آنسو بہاتی دہائیاں دے رہی ہوتی یا کبھی خود بھی گالیاں بک رہی ہوتی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے میلے کچیلے ننگ دھڑنگ بچے مریم کی ٹانگوں سے لپٹے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا رہے ہوتے بڑا عجیب منظر ہوتا۔ میرے قدم وہاں پہنچتے پہنچتے سست پڑ جاتے لیکن رک کر تماشا دیکھنے کی میں نے کبھی ہمت نہ کی۔ ایک دو بار میں نے گشتی پولس کو اُس کے شوہر کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا مگر پاس پڑوس کے کسی شخص کو مداخلت کرتے نہ دیکھا تھا شاید اِس ڈر سے کہ کون کیچڑ میں پتھر مارے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ یہ عورت کیوں کر اپنے بدخصلت

شوہر کے مظالم برداشت کرلیتی ہے۔؟

وہ شادابی کی کن سے سکھ دیتا ہوگا؟ سوائے دکھ درد کے اُس کی زندگی میں کیا ہوگا؟ قسمت کو رونے اور کوسنے کے بجائے وہ اس کنارہ کشی کیوں نہیں کرلیتی؟ روز روز کی کٹ کٹ روز روز کی جھک جھک ..... مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی تھی مگر باوجود ہمدردی کے میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر سروس کے سلسلے میں مجھے کلیانی چھوڑنا پڑا۔ جگہ بدل گئی لوگ بدل گئے ~~لوگ~~ زندگی کے مسائل اور مصروفیات میں کچھ ایسے کھو گیا کہ میں اُس عورت کو بھول گیا اور اب برسوں بعد وہی عورت میرے سامنے تھی اور مجھے گذرے ہوئے کل کی طرح ساری باتیں یاد آگئی تھیں۔

ناشتے کے بعد میں عادت کے مطابق اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظر دوڑانے لگا مریم کچن سے آکر برتن اُٹھانے لگی تو میں یوں ہی پوچھ بیٹھا "اب تمہارا شوہر کیا کرتا ہے"۔؟

اس کے ہاتھ کانپ گئے اور برتنوں کی ٹرے اُس کے ہاتھوں سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔

"جی بابو وہ تو کب کے گذر گئے" اس کا گلا رندھ گیا اور پلکیں بھیگ گیئں۔ اُس نے ٹرے میز پر رکھی اور ساڑی کے آنچل سے آنکھیں خشک کرنے لگی۔

"تم اس آدمی کے لیے روتی ہو جو بات بات پر تمہیں مارا کرتا تھا۔ پیٹ پیٹ کر تمہیں بے حال کردیتا تھا" "نشے میں اُسے ہوش کہاں ہوتا تھا۔ مگر جب ہوش میں ہوتا تو میرے زخموں پر انگلیاں پھیر پھیر کر روتا تھا مجھ سے معافی مانگتا تھا ... وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ آخر میرا آدمی تھا"۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کی آنکھوں میں فخر کی جھلک نمودار ہوئی اور آنسوؤں کے پردے میں معدوم ہو گئی۔

اُس کے ہوتے کوئی ٹیڑھی نظر سے مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ آنسوؤں پر قابو پا کر بدقت تمام اُس نے رندھے گلے سے کہا اور ٹرے اُٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

وہ ایک جاہل گنوار اور نچلے طبقے کی عورت تھی میرے خیال سے اُسے محبت اور شوہر پرستی کے لطیف جذبے کا اہل نہیں ہونا چاہیے تھا ...... مگر فرحت ؟

میری نگاہ سامنے کی دیوار پر آویزاں فرحت کی مسکراتی تصویر پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہی ہو ... میں نے تصویر سے نظریں ہٹا کر اخبار اُٹھا لیا۔ +

اردو کی نئی نصابی کتابیں

ہمارا انتخاب

ڈاکٹر محمد صابرین

جہاں تک ملک میں اردو زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق نصابی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے آزادی کے بعد اس نے افسوس ناک صورت اختیار کرلی ہے۔ جن مضبوط بنیادوں پر ہندوستان کی آزادی کے ستون تعمیر کئے گئے تھے۔ حصول آزادی کے بعد وہ کچھ کمزور پڑنے لگے۔ قومی یک جہتی، جمہوری اقدار اور قومی اتحاد کے شعور کی کڑیاں بھی کچھ ڈھیلی پڑنے لگی تھیں۔ اس سے پورا ملک اور سماج متاثر ہوا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ملک میں رائج مختلف زبانیں اور نظام تعلیم بھی متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ آزادی کے بعد جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو سیاست زدگی کی ایسی شکار ہوئی کہ اسے اپنے ہی ملک میں غیر ملکی زبان سمجھا جانے لگا۔ اردو میں نصابات اور درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام یا تو ختم ہو گیا یا پھر ان کتابوں کی تیاری کا کام ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ گیا جو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے اصول اور نصابات کے جدید تقاضوں سے واقف نہیں تھے۔ اس کے برعکس جیسے جیسے ہندوستان میں جمہوری اقدار کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور قومی اتحاد کا شعور پیدا ہونے لگا۔ سرکاری سطح پر اردو کی اہمیت بھی محسوس کی جانے لگی۔ ملک کے تعلیمی منصوبوں میں دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی و ترویج کا بھی خیال رکھا گیا۔ اس دوران محبان اردو کی جانب سے بھی اردو کی بقا کے لئے بعض سطحوں پر کوششیں جاری رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس میں اردو کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے نجی طور پر بھی بہت سی انجمنوں، تعلیمی بورڈوں، ٹیکسٹ بک کارپوریشنوں سرکاری و نیم سرکاری اداروں نے ریاستی اور علاقائی ضرورتوں کے تحت اردو میں نصابات اور درسی کتابیں تیار کی ہیں۔

اردو کے ان مروجہ نصابات کے تحت جو درسی کتابیں تیار کی گئی ہیں ان میں تعلیمی لسانی نقطۂ نظر سے بعض کتابیں عمدہ ہیں مگر وہ موجودہ زمانے کی تعلیمی اور تدریسی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتیں۔ ان کتابوں کو یا تو ریاستی ضرورتوں کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے یا پھر مذہب کی بنیاد پر۔ ان میں عموماً ایسے اسباق شامل کئے گئے ہیں جو متعلقہ ریاست کے کام، ماحول، رسم ورواج، رہن سہن، تاریخی مقامات اور وہاں کی عظیم شخصیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض ریاستوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یعنی متعلقہ ریاست کے بارے میں کچھ بھی اسباق کی شکل میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ نثر و نظم کا تناسب کیا ہونا چاہئے، زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے لئے مدارس میں عموماً کتنا وقت درکار ہے اور مختلف درجات میں طلبہ کی نفسیات اور ان کے معیار کا خیال کیے بغیر یہ نصابی کتابیں مرتب کر دی گئی ہیں۔ جن میں تدریج کا فقدان تو جا بجا نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظموں کا انتخاب بھی اچھا نہیں ہے۔ مضامین غیر دلچسپ ہیں۔ معلومات عامہ، جدید سائنس، سماجی علوم، صحت اور کھیل کود سے متعلق معلوماتی مضامین، ملک کے عام مسائل کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے مضامین کا فقدان بھی ان میں ملتا ہے۔ ان کتابوں میں شامل بیشتر مشقیں اور سوالات بھی غیر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت وضع کیے گئے ہیں۔ مضامین میں تکرار پائی جاتی ہے۔ ایک ہی سبق یا نظم بعض اوقات مختلف درجات میں نظر آتی ہے۔ ملک میں سائنس کی ترقی اور ایجادات کے ذکر کا یہ عالم ہے کہ بات ریڈیو، ٹیلی فون اور گراموفون سے آگے نہیں بڑھتی۔ بعض کتابوں میں ہندوستان کی آبادی ابھی تک ساٹھ کروڑ ہے اور بعض پروفیسر آل احمد سرور ابھی تک شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ اور بعض میں پروفیسر احتشام حسین ابھی حیات ہیں۔ اس طرح کی اور بھی بے شمار مثالیں ان کتابوں سے دی جا سکتی ہیں۔

پہلی سے آٹھویں اور نویں سے بارہویں جماعت تک معیار

میں اصولاً بتدریج اضافہ ہونا چاہئے مگر اس کے بجائے ان کتابوں میں کبھی معیاری مضامین پہلے آجاتے ہیں اور کم معیاری بعد میں۔ شعری اور ادبی انتخاب نسبتاً ناقص نظر آتا ہے جو طلبہ کی دلچسپی اور ان کے ذہنی معیار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ شعری اور ادبی انتخاب کی بگڑی ہوئی صورت نویں اور دسویں جماعت سے زیادہ گیارہویں اور بارہویں جماعت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ ان کتابوں میں رنگین اور جاذب نظر تصاویر کا بھی فقدان ہے۔ مذکورہ بالا سبھی نصابی کتابوں کا معیار اور انداز باہم مختلف ہے۔ بھدی چھپائی خراب کتابت، گھٹیا کاغذ، بدصورت سرورق غرض کہ بلا ترتیب آرائشی انداز ان کتابوں میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔

مذکورہ پس منظر کی روشنی میں اب تعلیمی پالیسی کے تحت موجودہ زمانے میں زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لئے قومی یک جہتی اور جمہوری نقطہ نظر کی بنیادوں پر یکساں نصابات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اور اردو میں یہ کمی شدت سے محسوس کی گئی ہے۔ ہندوستان میں اردو کی اہمیت کے پیش نظر آزادی کے بعد پہلی مرتبہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ "نئی دہلی" نے مدارس میں اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے قومی سطح پر ایک مخصوص منصوبے کے تحت درجۂ اول سے درجہ بارہ تک کے لئے نئی نصابی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور ان کی طباعت و اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اس نصاب کو درجہ اول سے پانچ تک، درجہ چھ سے آٹھ تک درجہ نو سے دس اور درجہ گیارہ سے بارہ تک چار شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نصابی کتابوں کے سلسلے میں بات کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ہماری موجودہ زمانے کی تعلیمی ضرورتوں کے مطابق ہوں جن کے ذریعہ بچوں میں خود اعتمادی، احساس ذمہ داری، حب الوطنی قومی یک جہتی، وطن پرستی، سچائی اور اخلاق و محبت وغیرہ کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ انسانی، اخلاقی، تہذیبی اور قومی اقدار کو بھی ان میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترتیب و تدوین کے مختلف مرحلوں سے گذر کر مذکورہ سبھی نصابی کتابوں کو آخری شکل دی جاچکی ہے۔ ان میں سے آٹھ کتابیں "اردو کی نئی کتاب" کے نام

سے شائع ہو چکی ہیں۔ دہلی کے علاوہ بعض دوسری ریاستوں نے بھی انھیں انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ باقی چار کتابیں زیر طباعت ہیں۔ اور عنقریب ان کے منظر عام پر آنے کی قوی امید ہے۔

پہلی اور دوسری جماعت کی نصابی کتابوں کا سائز ۲۳×۳۶/۸ ہے تیسری، چوتھی اور پانچویں کا سائز ۱۵×۱۰/۴ ہے۔ یہ کتابیں بالترتیب ۸۴، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ قیمت نہایت مناسب، کاغذ عمدہ، سرورق جاذب نظر اور دلکش، کتابت اور طباعت معیاری، تصویریں رنگین اور جاذب نظر ہیں۔ پہلی اور دوسری کی نئی نصابی کتابوں کے ذریعے سائنٹفک مگر آسان ترین اور دلچسپ طریقہ تدریس کی مدد سے اردو زبان سکھانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ لسانی مہارتوں پر کافی حد تک عبور حاصل کرانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

تیسری کتاب کا نثری حصہ دلچسپ کہانیوں، سائنسی ماحولیاتی، جغرافیائی، تاریخی اور بعض اہم تہواروں اور شخصیتوں کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ شعری انتخاب حالی، چکبست حفیظ الدین شوقی، اسمٰعیل میرٹھی، وفا فرخ آبادی، رام کرشن مضطر، تلوک چند محروم اور محمد فاروق دیوانہ کی نظموں پر مشتمل ہے۔ چوتھی جماعت کے نثری حصہ میں بھی مذکورہ موضوعات پر اسباق شامل کئے گئے ہیں البتہ شعری انتخاب میں حفیظ جالندھری، اقبال اسماعیل میرٹھی، حالی، جوالا پرشاد برقی اور شفیع الدین نیر کی آسان اور دل چسپ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ پانچویں کتاب کے نثری حصے میں ڈاکٹر ذاکر حسین گوپی چند نارنگ اور رام لعل کی نگارشات کے حصوں کے علاوہ مؤلفین کے تحریر کئے ہوئے اسباق بھی شامل کئے گئے ہیں جو اخلاقی، سائنسی، کھیل کود، ماحولیاتی، ادب، چرند پرند تہوار اور آزادی وغیرہ سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ شعری انتخاب آرزو لکھنوی، اقبال، اسمٰعیل میرٹھی، حفیظ، مجاز، افسر میرٹھی، جگن ناتھ آزاد اور حالی کی آسان اور دلچسپ نظموں پر مشتمل ہے

پرائمری سطح کی مذکورہ بالا نئی نصابی کتابوں میں جملہ نثری اور شعری

باعتبار درجے کے معیار اور بچوں کی عمر کے عین مطابق ہے۔ بچوں کی دل چسپی کیلئے تمام اسباق سے متعلق بے حد دل کش، رنگین اور جاذب نظر تصاویر سے ان کتابوں کو مزین کیا گیا ہے ان نصابی کتابوں کو کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد طلبہ پانچویں جماعت کے معیار کے مطابق اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار پر کسی حد تک قدرت حاصل کر سکتے ہیں۔ چھٹی سے آٹھویں تک کی نصابی کتابوں کا سائز بھی ۱۵×۲۰/۸ ہے یہ کتابیں بالترتیب ۱۷۷، ۱۷۱ اور ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ سرورق بہت خوبصورت اور قیمتیں بہت کم ہیں۔ چھٹی کتاب کے نثری حصے میں ڈاکٹر ذاکر حسین میر باقر علی دہلوی، حامد اللہ افسر، پریم چند، گوپی چند نارنگ، جواہر لعل نہرو، لیو ٹالسٹائی، اطہر پرویز، رابندر ناتھ ٹیگور جیسی اہم شخصیتوں کی نگارشات کے حصے ضرورت کے مطابق شامل کئے گئے ہیں۔ بعض اسباق مؤلفین کے تحریر کئے ہوئے بھی شامل ہیں۔ شعری انتخاب حامد اللہ افسر، اسمٰعیل میرٹھی، نظیر اکبرآبادی، تلوک چند محروم، اقبال، محمد مصطفےٰ خان مداح، حالی، محمد فاروق دیوانہ، نجم آفندی، بسمل سعیدی اور شفیع الدین نیر کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ساتویں کتاب کے نثری حصے میں مجیب احمد خان، نور الحسن ہاشمی، راشد الخیری، امتیاز علی تاج، نور الحسن نقوی، مبارز الدین رفعت، نور الٰہی، محمد عمر، عبدالحق اور منشی پریم چند کی نگارشات کے منتخب حصے بھی شامل ہیں۔

بعض اسباق مؤلفین نے بھی تحریر کئے ہیں۔ شعری حصے تلوک چند محروم، اقبال، افسر میرٹھی، سکندر علی وجد، محمد صدیق مسلم، اکبر الہ آبادی، روشن صدیقی، نظیر اکبر آبادی اور حالی کی نظموں پر مشتمل ہے۔ آٹھویں کی کتاب کے نثری حصے میں سرشار، سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، مرزا فرحت اللہ بیگ، عبدالحلیم شرر، عبدالحق، مرزا کوکب قلدر، ہارون خان شیروانی، اظہار اثر اور سید عابد حسین جیسے اہم ادیبوں کی نگارشات کے حصے شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ چند

اسباق مؤلفین نے بھی تحریر کئے ہیں شعری حصہ اقبال، غالب، دیوانہ، حالی، مجاز، جاں نثار اختر، سرور جہاں آبادی، نظیر اکبر آبادی، بے تلف شاہ، اختر شیرانی کی نظموں پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بالا اردو کی نئی نصابی کتابوں میں جملہ انتخابات کے لئے درجے کے معیار، بچوں کی عمر اور ان کی دلچسپی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے یہ کتابیں بھی رنگین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں۔ ان نصابی کتابوں کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ان کے مطالعے کے بعد یقیناً طلبہ آٹھویں جماعت کے معیار کے مطابق آزادانہ طور پر اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل کر سکیں گے۔ ان کتابوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں تعلیم کے جدید تقاضوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ نثری اور شعری انتخابات ایسے ہیں جن سے بنیادی زبان کی واقفیت، اردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا، جملے کی ساخت، اجزائے کلام، لفظوں کے معنی، صحتِ املا، صحتِ تلفظ، مطالب کو سمجھنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ قومی، سماجی، اخلاقی اقدار سے روشناس ہونے کا موقع بھی طالبعلموں کو ملتا ہے اور آزادانہ غور وفکر کی عادت پڑنے کے روشن امکانات موجود بھی ہیں۔ اسباق کے ذریعہ مذکورہ اقدار پر عمل کا جذبہ بھی طلبہ میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر سبق کے بعد مشقیں اس طرح سے ترتیب دی گئی ہیں کہ نئے الفاظ اور معنی طالب علموں کے ذہن نشین ہو جائیں۔ زبان سے متعلق نئے نئے نکات بھی بتدریج سامنے آتے رہیں۔ صرف ونحو کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ معیاری اردو سیکھنے کے ساتھ ساتھ شعر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہو۔ ہر سبق کے بعد مشکل الفاظ اور ان کے معنی بھی دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مکمل فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے۔ تاکہ طلبہ کو حوالے میں آسانی ہو اور لغت کے مطالعے کی عادت بھی پیدا ہو جائے۔

اس سلسلے کی نویں سے دسویں اور گیارہ سے بارہ درجات کی

نئی نصابی کتابوں کا سائز $\frac{۲۳ \times ۳۶}{۱۶}$ ہے۔ یہ کتابیں بالترتیب ۲۴۷، ۳۸۱، ۳۰۱

تکمیل

اور ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔ قیمتیں بہت کم ہیں۔ کاغذ بہت عمدہ ہے سر ورق ان کتابوں کا درجے کے معیار کے مطابق ہے۔ کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ مذکورہ چاروں کتابوں میں شامل ادیبوں اور شاعروں کے ( ) بہت ہی عمدہ اور جاذب نظر تیار کرائے گئے ہیں جو نایاب ہیں۔

اردو کی نئی کتاب برائے جماعت نویں میں اردو شعر و ادب کے کچھ ارتقائی نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں حصہ نثر فضل علی فضلی، میرامن، رجب علی بیگ سرور، غالب، سرسید، محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، رتن ناتھ سرشار، شبلی نعمانی اور محمد حسین جاہ کی نگارشات سے مزین ہے۔ حصہ شعر میں محمد قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سودا، میر درد، میر تقی میر، مصحفی، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، مومن، داغ، میر غلام حسین، مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم کے منتخبات شامل ہیں۔ اس کتاب کا حصہ نثر، داستان، خطوط، مضمون نگاری، انشائیہ نویسی، سوانح حیات، تنقید اور سفرنامے پر اور شعری حصہ غزل، مثنوی اور رباعی پر مشتمل ہے۔ اردو کی دسویں کتاب کا حصہ نثر مرزا رسوا، پریم چند، پطرس، کنھیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، صالحہ عابد حسین، مولوی عبدالحق، آل احمد سرور، احتشام حسین اور گوپی چند نارنگ کی نگارشات سے مزین ہے۔ حصہ شعر میں حالی، شاد عظیم آبادی، اقبال، حسرت موہانی، اصغر، فانی، جگر، یاس یگانہ چنگیزی، آرزو لکھنوی، فراق، فیض، آنند نرائن ملا، خلیل الرحمٰن اعظمی، نظیر اکبر آبادی، چکبست، بے نظیر شاہ وارثی، اقبال، جمیل مظہری، جوش، میرا جی، مخدوم، اختر الایمان، علی سردار جعفری، سودا، انیس، فانی، تلوک چند محروم اور اختر انصاری، کے منتخبات شامل ہیں۔ اس طرح مذکورہ کتاب کا حصہ نثر، انشائیہ، ناول، افسانہ خاکہ نگاری مضامین پر شعری حصہ غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ رباعی اور قطعہ پر مشتمل ہے۔

نویں اور دسویں کی نئی نصابی کتابوں کی اہم مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر سبق سے پیشتر ادیب یا شاعر پر ایک مختصر مگر جامع سوانحی نوٹ کے

بیوگرافی تکمیل

ساتھ اس کے طرز تحریر پر نارنگ کے کلام کی خصوصیات کی بھی وضاحت سے تحریر کی گئی ہیں۔ تاکہ طالب علموں میں علم زبان کے ساتھ ساتھ اسلوب تحریر کو پہچاننے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جا سکے۔ اسباق کے اختتام پر جس انداز سے معنی اور اشارے عبور کرنے کی بات اور مشق اور مطالعے کی ترکیب پیش کی ہے۔ اس سے یقیناً ادب و شعر کے منتخب نمونوں کو با آسانی اور بہتر طور پر سمجھایا جا سکتا ہے۔ اہم نکات کو اچھی طرح ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ مشق کا یہ طریقہ طالب علموں ہی کے لئے نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی کافی اہمیت کا حامل مشقوں میں اس جدت کو اسکولی سطح پر ادب و شعر کی افہام و تفہیم کا ایک نیا اور سائنٹفک طریقہ کہا جا سکتا ہے۔

تعلیم کی گیارہویں اور پھر بارہویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے طالب علموں میں غور و فکر کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔ زبان و ادب کی افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ ان میں تخلیقی شعور پیدا ہونے لگتا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں کی کتاب کے مشمولات کے لئے ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان نئی نصابی کتابوں میں ادب و شعر کا نکھرا ہوا اور مطلوبہ معیاری انتخاب شامل ہے۔ گیارہویں کی کتاب میں شامل نثری اصناف میں داستان خطوط، مضمون، خاکہ، افسانہ اور سفرنامے کا تعارف کرایا گیا ہے۔ حیدر بخش حیدری، میر امن دہلوی، سرسید احمد خان، حالی، فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، عبدالحلیم شرر، خواجہ غلام السیدین، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، پریم چند، سید رفیق حسین، اور گوپی چند نارنگ کی نگارشات کے منتخب معیاری نمونے درج کئے گئے ہیں شعری اصناف میں غزل، رباعی، مثنوی، قصیدہ اور نظم کے انتخابات شامل کئے گئے ہیں۔

بارہویں کی کتاب میں حصہ نثر محمد حسین آزاد، پطرس، شبلی

رشید احمد صدیقی، ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، مسعود حسن رضوی، آل احمد سرور، مسعود حسین خان، [illegible] احمد، محمد مجیب، راجندر سنگھ بیدی اور سید عابد حسین کی نگارشات کے منتخب معیاری نمونے شامل کئے گئے ہیں۔ حصہ شعر میں سراج اورنگ آبادی، سودا، درد، ناسخ، ذوق، مومن، شاد عظیم آبادی، اصغر، فراق، جاں نثار اختر، مرزا شوق، انیس، دبیر، اکبر الہ آبادی، جوش، اقبال، اختر الایمان کے منتخبات شامل ہیں۔ اس طرح کتاب کا حصہ نثر انشائیہ، مکتوب، مضامین، تنقید، ناول، ڈرامہ، افسانے پر اور شعری حصہ غزل، مثنوی، مرثیہ اور نظم پر مشتمل ہیں۔

مذکورہ بالا اعدادی نئی نصابی کتابوں کے حصہ نثر میں اہم ادیبوں کی نگارشات کے منتخب معیاری نمونوں اور شعری انتخابات کی شمولیت کے ساتھ ساتھ شامل اصناف سخن پر جامع تعارفی نوٹ قلمبند کئے گئے ہیں۔ ہر سبق کے بعد فرہنگ اس انداز سے دی گئی ہے کہ طلبہ کے لئے سبق کا مطالعہ آسان ہو جاتا ہے۔ ان کتابوں میں قومی اور سماجی اقدار کی نمائندگی کی گئی ہے۔ درجے کے معیار کی عام ذہنی سطح کا لحاظ رکھ کر ہی ادبی انتخاب کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کتابوں میں قدرے زیادہ گہرائی کے ساتھ اصناف ادب کا تعارف کر دیا گیا ہے۔ جس کی بناء پر طلبہ میں مزید آزادانہ غور و فکر کرنے اور مختلف انداز سے خیالات و افکار کے اظہار کے مواقع سامنے آئیں گے۔ اردو کے طلبہ اپنی مادری زبان اور اس کے ادب و شعر کی خوبیوں سے واقف ہوں گے۔ ملک کی ملی جلی گنگا جمنی تہذیب اور تاریخ سے واقف ہوں گے۔ اور اس بناء پر وہ قومی نصب العین کے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔ ان نصابی کتابوں میں جدید ادبی رجحان سے بھی طلبہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔ املا اور تلفظ کی صحت پر خاص توجہ دی گئی ہے البتہ اسباق کے آخر میں سوائے فرہنگ کے دیگر مشقیں وضع کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ غالباً تعلیم کی سطح پر سبق کے آخر میں روایتی انداز کی مشقوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تحقیق یعنی پہلے سے بارہویں جماعت تک کی نئی نصابی کتابوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں ایسی مفید سستی اور ہر

(بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر)

غزل

جگن ناتھ آزاد

خرد کا سفینہ جنوں کے ہیں دھارے
کبھی اِس کنارے کبھی اُس کنارے

نگاہیں تھیں اور مہوشوں کے نظارے
کچھ ایسے بھی ایام، ہم نے گزارے

محبّت کا دریا وفا کا سفینہ!
یہ بے باک موجیں یہ بے تاب دھارے

فقط اک نظر کے ہیں محتاج اے دل
یہ رنگین شفق یہ حسیں چاند تارے

کٹھن منزلیں تھیں وفاؤں کی لیکن
میں بڑھتا گیا بے خودی کے سہارے

تری جستجو میں مری آرزو نے
بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے

نہ ذرّوں کو ان سے کوئی فیض پہنچا
چمکتے رہے آسماں پر ستارے

وہ خورشید نکلا وہ خورشید نکلا
وہ ڈوبے ستارے وہ ڈوبے ستارے

عجب شے ہے آزادؔ ذوقِ نظر بھی
ہوئیں منزلیں طے اسی کے سہارے

اے ۲۵۰، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں (توی) ۱۸۰۰۰۴ جموں کشمیر

غزل

حمید الماس

●

دھندلی فضا تھی ہاتھ میں سنگِ عذاب تھا
مجھ جیسے تہہ نشیں پہ یہ کس کا عتاب تھا

میری کتابِ عمر کا یہ وصف خاص ہے
شامل کہیں نہ اس میں کوئی انتساب تھا

قائم نہ رکھ سکا تری محفل سے رابطہ
وہ بدنصیب جب کہ سرِ انتخاب تھا

تقسیم کے عمل میں رہی زندگی تمام
دل مطمئن رہا کہ مقدر حساب تھا

معصوم نرم گوئی میں جل بجھ کے رہ گیا
لہجے میں دھوپ تھی نہ کہیں التہاب تھا

جب فیصلہ سنا تو چمن زار کھل اٹھے
اس کے قلم کی نوک میں رنگِ گلاب تھا

تاریکیوں میں کھو گئی دانش وری کی صبح!
الماسؔ گرچہ پیش روِ آفتاب تھا!

۹۲۲، اپسنائر، ۲۸ مین، بلاک ۹، جے نگر، بنگلور ۶۹۰۰۶۰ ـــ

غزلیں

ایم کوٹھیاوی راہی

قیس و فرہاد کا فسانہ کہا
تونے جو کچھ کہا پرانا کہا

کم نہیں یہ عمل بھی دنیا میں
پتھروں کو اگر خدا نہ کہا

ملنے والا تھا بے پناہ امیر
گھر کو جس نے غریب خانہ کہا

مرتے دم تک ترے فقیروں نے
دشمنوں کو بھی بے وفا نہ کہا

جل رہا تھا ہمارے دل کا لہو
پھر مگر تجھ سے اے ہوا نہ کہا

نظم کہتے رہے مزاروں پر
بیٹھ کر گھر میں مرثیہ نہ کہا

سرپھرا' بد قماش' آوارہ
جو کہا اس نے غائبانہ کہا!

اس کی بد دشیزگی سے اے راہی
گرم لمحوں کا واقعہ نہ کہا

فسردہ پھونک دیا بادلوں کی
گھروندے توڑ دیے سرپھری ہواؤں نے

وہ خواب دیکھ رہا تھا سنہرے نغموں
سُلا دیا تھا جسے نقرئی صداؤں نے

بسا کے شہر کسی کا اجاڑ دی بستی
کہ خود کو پھونک دیا چاہتوں کے گاؤں نے

حنا محل کے در و بام پھر بلاتے ہیں
بھلا دیا تھا جسے سرخ داشتاؤں نے

سیاہ رات کی اجلی غزل کا خون کیا
مشاعرے کے پرانے غزل سراؤں نے

صدا سے کھل گئے مندروں کے بند دروازے
دکھائیں صورتیں کیا کیا نئی دشاؤں نے

جھٹک کے ٹوٹ گئی شب کی سرد خاموشی
سخن کی جوت جلائی تری اداؤں نے

پگھل کے رہ گئے پتھر کے چارہ گر لیکن
اثر کیا مری آماں تری دعاؤں نے

غزل

جینت پرمار

زلفوں کو لہرا بیٹھے
دھوپ کنارے آ بیٹھے
انگوٹھی میں نگ جیسا
اس کا نام سجا بیٹھے
تنہائی میں جانے کیوں
خوف خدا کا کھا بیٹھے
اس کی گلی سے گذرے تھے
دل کو روگ لگا بیٹھے
اپنی طبیعت تھی ایسی
سب سے الگ تنہا بیٹھے
ریت پہ جوتے پھینکے اور
گھر کی یاد بھلا بیٹھے
میں تنہا تھا ایسے میں!
چاند ستارے آ بیٹھے

اشعار

فصیح اکمل

رات جنگل میں اندھیرے کے پرستاروں کو
ایک مقتول نے سورج کا پتہ بتلایا
اب کے مقتل کی صدائیں بھی بہت دور گئیں
کوئی تشہیرِ وفا کر کے بہت پچھتایا
زخم قاتل سے تمنائی مرہم تو نہ تھے!
کیوں یہ پھر دستِ مسیحا نے کرم فرمایا
صحنِ محرابِ شکستہ میں اذاں لہرائی!
کچھ سسکتی ہوئی سانسوں میں دھواں بھر آیا

دھرتی ساری سوکھ گئی ہے رام گسائیں پانی دے
بادل بادل چیخ رہی ہے رام گسائیں پانی دے
ریت پہ ننگے پیر کہاں تک مانگیں اپنے تیر کہاں تک
پریم کی ندیا سوکھ گئی ہے رام گسائیں پانی دے
سورج ہم کو چاٹ چکا ہے، اندر تک سے کاٹ چکا ہے
سانسوں کی بس ڈور بچی ہے رام گسائیں پانی دے
کال پڑا ہے سوکھا ہے، بچہ بچہ بھوکا ہے
دیکھ تو کیسی دکھ کی گھڑی ہے رام گسائیں پانی دے

۱۱۸- سلمیٰ منزل، کوکی واڑہ، دستی، ضلع تھانے
بھیونڈی

غزلیں

علی ظہیر

کوئی ملتا، بچھڑتا سا رہا ہے
یہ دھوکا عمر بھر ہوتا رہا ہے

کرب آنے کی خوشیاں مٹ گئیں کیا
مری آنکھوں سے کیا رستا رہا ہے

ہوئی ہے جب بھی بارش ہلکی ہلکی
دلِ وحشی کو اک سکتہ رہا ہے

پرندے اپنے پر پھیلا کے بولے
چلو اڑتے رہو وہ آ رہا ہے

تمہارے ساتھ رہنا جرم ہے کیا
یہ کیوں سایا سا اک لہرا رہا ہے

چلو بیٹھیں کہیں اپنائیت سے
ظہیرؔ اٹھو کہ اب دن جا رہا ہے

سازا پارٹمنٹ، روڈ نمبرا، بنجارہ ہلس، حیدرآباد نمبر ۳۴
تلنگانہ

ضیاء الانجم

نا فہمِ حقیقت تھے خود افکار بہت تھے
خود کارِ اذیت میں گرفتار بہت تھے

ہر شے جو چمکتی ہے نہیں ہوتی ہے سونا
ذرے تری راہوں کے چمکدار بہت تھے

سائے کے لیے کوئی بھی دیوار نہیں تھی
کہنے کے لیے صاحبِ دیوار بہت تھے

تپتے ہی رہے وقت کی تیزاب فضا میں
حالاں کہ مری راہ میں اشجار بہت تھے

تضحیک میں اپنوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے
صف بستۂ آداب تو اغیار بہت تھے

اک تو ہی تھا جس نے مجھے بے دام خریدا
ورنہ تری بستی میں خریدار بہت تھے

سائے کی طرح چلتے رہے ساتھ وہ مرے
ویسے تو زمانے میں طرحدار بہت تھے

ظلمات کی وادی سے نکل آئے ہو بچ کر
اک تم ہی ضیاءؔ شہر میں ہشیار بہت تھے

غزلیں

کبھی جنگل، کبھی نگر ہے میاں
زندگی بھی عجیب تر ہے میاں

رشکِ جنت تو اپنا گھر ہے میاں
کس کو اس بات کی خبر ہے میاں

سلسلہ کار ہائے ہستی کا!!
کون کہتا ہے مختصر ہے میاں

بڑھ گئے ہو تو پھر بڑھے جاؤ
مرحلہ یوں تو پُر خطر ہے میاں

روشنی بھی، تپش بھی، سوزش بھی
انحصار اپنا آگ پر ہے میاں

لوٹ کر جس سے آ نہیں سکتے
اب تو درپیش وہ سفر ہے میاں

ان کو سورج سے کوئی ملوا دے
جن کی ہر رات بے سحر ہے میاں

قتل گاہوں کو شہر کہتے ہیں
ہر ہتھیلی پہ ایک سر ہے میاں

سازؔ اس بے وفا کی نظروں میں
کوئی تو ہے جو معتبر ہے میاں!

جلیل ساز

خود فریبی میں مبتلا ہیں سبھی
آپ کے شہر میں خدا ہیں سبھی

راہرو تو نظر نہیں آتے
اس قبیلے میں رہنما ہیں سبھی

کیسی انسانیت، کہاں کی وفا
ایک ہو کر جدا جدا ہیں سبھی!

کوئی مظلوم کا نہیں پُرساں
اور ظالم کے ہم نوا ہیں سبھی

قافلوں کو گئے زمانہ ہوا
دھندلے دھندلے نقوشِ پا ہیں سبھی

سب کے دل ہو چکے سیاہ یہاں
اور چہرے دلوں سے آئینہ ہیں سبھی

ایک میرے سوا زمانے میں
لوگ کہتے ہیں پارسا ہیں سبھی

موسم و جام، نغمہ و آہنگ
تم نہیں تو بے مزا ہیں سبھی

سازؔ حاصل کِسے قرار تھا
راہیِ منزلِ فنا ہیں سبھی

مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

غزلیں

رئیس الدین رئیس

وہ منظر سامنے ہے میری حیرانی نہیں جاتی
ہوا ہے بند اور دریا سے طغیانی نہیں جاتی

سمجھتا ہوں کہ میرے خواب ہیں تعبیر سے عاری
مگر آنکھوں سے خوابوں کی نگہبانی نہیں جاتی

چمکتے شہر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا اتنا
کہ مجھ سے شکل بھی اب اپنی پہچانی نہیں جاتی

ابھی شاید ہے سایہ نحوست کا اس حویلی پر
مرے دیوار و در سے اب بھی ویرانی نہیں جاتی

یہ لپنا بھی عجب ہوتا ہے جھوٹی وضع داری کا!
سبھی کچھ چھن چکا ذہنوں سے سلطانی نہیں جاتی

●

یہ زندگی بھی ہے اک جنگ اس کو جاری ر
مگر نہ خود پہ شکستوں کا خوف طاری ر

کوئی خوشی بھی حقیقی خوشی نہیں پیار
لبوں کو اپنے ہمیشہ ہنسی سے عاری ر

نہ چھین لے ترے لہجہ کا حسن یہ تقلی
کوئی تو لفظ غزل میں بھی اختیاری ر

یہ اور بات کہ ہیں سارے خواب بے تع
پلک پلک یونہی خوابوں کا گشت جاری ر

وقار فن کا اگر پاس ہے رئیسؔ تجھے
تو اپنے طور طریقے میں انکساری ر

۱۴۲۵/۱۰، دہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

غزلیں

نسیم اجمیری

لینے نہ دیا چین جدائی کی کسک نے
بے رنگ ہی رکھا مجھے خوابوں کی دھنک نے

تنہائی کے عالم میں سلگتی ہوئی راتیں
گویا مجھے جھلسا دیا شعلوں کی لپک نے

تجھ بن کیسے بھاتا ہے یہ پیغامِ بہاراں
کانٹوں کی چبھن دی مجھے پھولوں کی مہک نے

آنسو نہ مرے دیکھ ذرا اپنے ستم دیکھ
بھر جائے اگر جام تو لگتا ہے چھلکنے

مغرور نہیں ہوتیں جہاں دیدہ نگاہیں
پھل جائے اگر شاخ تو لگتی ہے جھکنے

ساغر مری آنکھوں کے بھرے بیٹھے تھے پہلے
اک ٹھیس لگی تھی کہ لگے اشک ٹپکنے

فہرست میں تنہا تو نسیم آپ نہیں ہیں
ذکرِ لب و رخسار کیا میر تلک نے

●

تھکن ابھی آنکھوں میں کم ہے درد بھی ہلکا ہلکا ہے
اتنی جلدی کیوں جاتے ہو بیٹھو اچھا لگتا ہے

تم سے پھر ذکر کیا بتلائیں اپنا جو بھی حال ہوا
رات بھی مشکل سے کٹتی ہے دن بھی سونا لگتا ہے

بیتے دنوں کی یادوں سے ایکا ایکی اداس ہوئے
ان کی آنکھوں کا کاجل بھی پھیلا پھیلا لگتا ہے

اس کی گلی سے جب میں گزرا کرتا میرے بارے میں
سکھیوں نے پوچھا تو بولی دیوانہ سا لگتا ہے

بات بات پہ قسم نہ کھاتا اب ہم کو وشواس نہیں
جس وعدے کے بیچ قسم ہو جھوٹا جھوٹا لگتا ہے

صدیوں سے ہر بہروپی نے گھونگھٹ پہ بھلا سے
صورت ہے اجنبیوں جیسی اور پیارا سا لگتا ہے

ہونٹوں کی گرمی سے میں تو سلگ سا گیا نسیم
اور وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے بولو کیسا لگتا ہے

پربت سر، ضلع ناگور (راجستھان)

غزلیں

قاسم امام

فضا میں زہر کے شعلے ہیں جانے کیا پگھل جائے
پَروں کو باندھ رکھنا قوتِ بازو نہ جل جائے

ٹھہرتی ہی نہیں راحت کی گھڑیاں، چین کے لمحے
کہ جیسے ریشم و کمخواب ہاتھوں سے پھسل جائے

کھلونوں کی دکانوں سے تہی دستی میں کیا گذریں
سرِ بازار کیا ہوگا اگر بچہ مچل جائے

یہی دھن مجھ پہ طاری ہے یہی کوشش ہے برسوں سے
کبھی قسمت لکیروں سے ذرا باہر نکل جائے

کوئی کوہِ گراں تھا یا مرا محکم ارادہ تھا
ہواؤں نے بہت چاہا سفر کا رخ بدل جائے

●

سراپا نور ہیں اور کہکشاں ہیں
مرے ماتھے پہ کچھ ایسے نشاں ہیں

وہ جس کو چاہتا ہے، چاہتا ہے
سمندر پر بھی کشتی کے مکاں ہیں

سروں پر سخت پتھر بولتے ہیں
گہر آلود منظر سائباں ہیں

بہت سرسبز تھے گرمی کی رت میں
بھری برسات میں ہم رائیگاں ہیں

بہت پیچھے سفر میں قافلے ہیں
امامؔ اپنی نظر میں آسماں ہیں

۱۵/۱۶، رئیسہ بائی چال، قریش نگر، کرلا (بل)، بمبئی ۷۰

کھو جائے یہ زمین مگر آسماں رہے
اپنی نظر کے سامنے اپنا مکاں رہے

کافی ہے ایک پیڑ ہی آنگن کے واسطے
ہم کب یہ چاہتے ہیں یہاں گلستاں رہے

منزل ہے گر قریب تو موسم کا خوف کیا
اپنے سروں پہ دھوپ رہے یا دھواں رہے

دونوں طرف کی جنگ میں اک ہار لازمی
ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ درمیاں رہے

اشعار میں کسی کا تصور ہے اس طرح
پانی میں جیسے چاند رہے کہکشاں رہے

اس کو بھی پتھروں سے ملے گا کوئی جواب
کچھ دیر میرے ساتھ رہے اور یہاں رہے

پانی کی آس دور تلک لے گئی امام
صحرا میں یوں چلے کہ قدم کے نشاں رہے

ہمارے بعد دھوپ تھی نہ سائبان تھا
جہاں تلک نظر گئی سروں پر آسمان تھا

جدا ہوا جو شخص اس کی بات ہی عجیب تھی
بچھڑ گیا جو راستہ وہی سفر کی جان تھا

میں ناؤ پہ سوار تھا، ندی کے اس طرف تھا
نہ قربتیں، نہ چاہتیں سفر بھی امتحان تھا

یہ سوچ سوچ کر لہو برس رہا ہے آنکھ سے
جو اٹھ گیا ابھی ابھی ہمارے درمیان تھا

بدن سے روح کھینچ کر امام کون لے گیا
سمجھ رہے تھے مستقل وہ عارضی مکان تھا

غزلیں

سلیم انصاری

نہیں ہے جرأتِ اظہار مجھ میں
تو پھر کیوں رکھ دیے انکار مجھ میں

زمیں زنجیرِ پا تسلیم! لیکن
کوئی اڑنے کو ہے تیار مجھ میں

میری آنکھوں میں زخمی ہیں کئی دل
کئی گھر ہو گئے مسمار مجھ میں

کہانی ہو چکی ہے ختم لیکن
ابھی زندہ ہے اک کردار مجھ میں

تراشِ اے وقت کے آذر مجھے بھی
چھپا بیٹھا ہے اک اظہار مجھ میں

میم فاروق

میں نے مانگا تھا کیا وفا کے سوا
آپ نے کیا دیا دغا کے سوا

قاتلوں کا سراغ کیسے ملے
کوئی شاہد نہیں خدا کے سوا

اس کے در پہ جبیں جھکے کیسے
پاس کچھ بھی نہیں انا کے سوا

زندگی کا وجود کچھ بھی نہیں
تری شوخی تری ادا کے سوا

تم ہو شامل مری دعاؤں میں
اور کیا چاہیے دعا کے سوا

بسترِ مرگ پہ عیادت کو
کوئی آیا نہیں قضا کے سوا

غزلیں

شیدا بگھونوی

چھوڑ کر اپنی ساری سہیلی ہوا
رات آئی تھی ملنے اکیلی ہوا

اپنے ماضی کے قصے سنا کر مجھے
اک غزل مجھ سے رنگین لے لی ہوا

دربدر، کو بہ کو، دشت جنگل پھری
جانے کس جوگیا کی ہے چیلی ہوا

تیرے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ کر
زندگی بن گئی ہے پہیلی ہوا

ایک طوفان اٹھا میرے احساس میں
جب بھی دل کے دریچے سے کھیلی ہوا

کیا بتاؤں کہ اب تک تمہارے لیے
زندگی کس طرح میں نے جھیلی ہوا

صبح ہوتے ہی شیدا کدھر کو چلی
اپنے دامن میں لے کر چنبیلی ہوا

●

سلسلے زخموں کے پیہم ملے ہیں
ٹوٹ کے جب بھی کسی سے ہم ملے ہیں

یوں تو کتنے ہم نشیں ہمدم ملے ہیں
دل ملے جس سے بہت کم ملے ہیں

وقت نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا
آپ بھی ملتے ہیں تو برہم ملے ہیں

جس طرف دیکھوں میں، عالم کربلا کا
لوگ سب کرتے ہوئے ماتم ملے ہیں

ٹوٹ کر میں اس طرح بکھرا ہوں شیدا
جس طرح اخبار کے کالم ملے ہیں

شاہ پور، بگھونی، سمستی پور، بہار

سوہو (لندن) کی ایک رات

جگن ناتھ آزاد

رقص یہ اصل میں ہے عالمِ دیجور کا رقص
گرچہ ظاہر میں ہے اک برقِ سرِ طور کا رقص

ظلمتِ جہل کا پروردہ ہوں میں کیا جانوں
اے نئے دور کی تہذیب! ترے نور کا رقص

دل مرا جنتِ افرنگ کہاں سمجھے گا
جن کمالوں سے عبارت ہے تری حور کا رقص

مرا وجدان مگر یاد دلاتا ہے مجھے
میں نے دیکھا تھا کبھی دار پہ منصور کا رقص

●

انیس سو نوے

مظہر الزماں خان

اے اُنیس سو نوے
پیدائش کے وقت
تیرا چہرہ
کتنا شفاف تھا
کہیں داغ تھا نہ دھبہ
بس چاند جیسا روشن تھا
کہ اچانک
ابھی تو پالنے میں تھا
کہ تیرے ناخن
تیرے قد سے بھی آگے نکل کر
تیرے چہرے اور جسم کو
لہولہان کر گئے
اے اُنیس سو نوے
خود کو نوچ نوچ کر
تو ایسا بھیانک کیوں ہو گیا
کہ اب تیرا چہرہ بھی
دکھائی نہیں دیتا

زنجیرہ

سلیم شہزاد

مسکان کلی کی

تتلی جب اڑی
پتھر پر کھدے پھول سے
پھول پر تھا لہو
لہو کا دریا
بہ رہا ہے بدن میں
زرخیز ہے مٹی
مٹی دامن سے
چھڑا بھی لیں ہم لیکن
مٹتی نہیں یاد
یاد ایک موسم ہے
اور اس کے روپ رنگ جیسے
فریم میں قید تصویر
تصویر کا شیشہ
ٹوٹا ہوا ہے لیکن
لب پر ہے مسکان

میرے سوال کا جواب
بے ثبات ہر پھول
پھول نہیں شاخ پر
مکڑی جال کے ڈِزائن میں
الجھ گئی آنکھ
آنکھ پتھرا گئی
ساری عینکیں بے کار
بے کار سارے رنگ
رنگ منظر منظر
اپنا جادو جگاتے
مگر یہ دھواں
دھواں بے چہرہ
پھیلا ہوا ہے چار سو
دھواں ہر چہرہ
چہرے سے کچھ بھی
اندازہ نہیں ہوتا
بے کرنٹ سب تار

تار سب کٹ چکے
اپنے اور اس کے لیے
ہم کہنا غلط
غلط در غلط
سب قصے کہانیاں
والعصر انّ الحق

۳۲۲ - منگل وار دوارکا مالے گاؤں ۴۲۳۲۰۳

حاصل

فصیح اکمل

وہ گھر
جس کے خواب سجاتے
آنکھیں تھکنے لگتی ہیں
پاؤں رستہ چلتے چلتے
حوصلہ ہارنے لگتے ہیں
بازو شل ہو جاتے ہیں
اک اک پور قلم کی صورت
لہو لہو ہو جاتی ہے
اس خون پسینے کا حاصل
کچھ ٹوٹی پھوٹی، بچی کچھی
السائی ہوئی سی سانسوں کو
بے رنگ و روغن کمرے کی
بے سورج صبح و شام ملے
کچھ بچوں کا کہرام ملے
کچھ دھواں دھواں سی ہوک ملے
کچھ کھانسی اور کچھ بھوک ملے
ان بھاگتے دوڑتے لمحوں کے ہاتھوں میں سنہری تان کہاں
وہ گملے پھولوں والے کہاں، انگنائی کہاں دالان کہاں
اس خواب سجانے کا حاصل
بس خود کو کھونا ہوتا ہے
یا قبر کا کونا ہوتا ہے

تکمیل

مجھے چھوڑ کر

سرور ساجد

مجھے چھوڑ کر کچھ بھی تبدیل ہونے
کے حق میں نہیں تو
چلو پھر!
یہ نفرت کی جھوٹی سیاست کی پوشاک
بھی
پیار کے آبِ زم زم سے دھو دیں

کہیں ایسا نہ ہو جائے

وہ میری دوست ہے لیکن
مجھے کچھ ایسا لگتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو جائے
مری خاطر
وہ اپنے دوستوں سے
کچھ نہ کہہ بیٹھے
بھروسہ مجھ پہ اتنا نہ بڑھائے
کہ
اسے خود اپنے مرکز کے
تعین پر ہنسی آئے ——— !!

۱۲۵۷، حویلی حسام الدین حیدر، بلی ماران، دہلی ۶-۱۱۰۰
بھیونڈی

ایک گیت

میم۔فاروق

میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
یوں نہ تڑپایا کرو
شب کے سناٹے میں ہو کے بے نقاب
جیسے نکلا ہو افق سے ماہتاب
چاندنی چھت پر نہ برسایا کرو
میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
بیٹھ کے چپ چاپ ساحل کے قریب
اپنی خوشبو لیے دل کے قریب
منظروں میں یوں نہ کھو جایا کرو
میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
بھر کے آنکھوں میں کسی کا انتظار
چونکنا آہٹ پر وہ بار بار
دل اگر دھڑکے تو سمجھایا کرو
میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
بے ارادہ اور یہ تنہا سفر
پھول سا پیکر لیے ہر گام پر
اجنبی راہیں نہ مہکایا کرو
میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
پیار والے اس زمانے میں کہاں
پہلے لو اس کی وفا کا امتحاں
پھر کسی پر زلف کا سایا کرو
میرے خوابوں میں نہ تم آیا کرو
یوں نہ تڑپایا کرو

الکہ۔ جی روڈ، بوعلی (ایسٹ) بمبئی ۹۶

آزاد نظمیں

سمیع الدین اظہر

(۱)

یاد ہے اس کو
ابھی تک
مہندی کی لکیروں سے
نام لکھنا میرا
اپنی ہتھیلی پر

(۲)

ڈھل جاتا ہے سورج
پھیل جاتی ہے سرخی
آسماں پر
تب
یاد آتے ہیں تیرے
حنا بھرے ہاتھ

صدی کی ٹریجڈی

جو ہے، اس کی مثالیں کب تک چلے گی
پچھلی صدی نے شروعات میں ایسا سوچا تھا
ایسا سوچا تھا اور لگ گئی
نئی نئی مثالیں گڑھنے
یہ صدی ان مثالوں کی حفاظت نہیں کر سکی
یہ صدی مثالوں کو
نیست و نابود کرنے والی صدی ہے
کیا اوقات ہے آدمی کی
کہ دوسرا آدمی
جس پر بھروسہ ہے
پاس میں بیٹھا بیٹھا
پوری کی پوری صدی کی پیٹھ پر چھرا گھونپ دیتا ہے
یہ صدی ان مثالوں کو بھی
برداشت نہیں کر پائے گی
کون جانے
کیا چھپا رکھا ہے اس صدی نے اپنی کوکھ میں
کیا پتہ
کیا رخ اختیار کرے گی یہ صدی
انسان مورچے پر تیار کھڑا ہے
صدی کی رفتار کے اضافی تعلق کے ساتھ جینے
ایک بار پھر آنکھیں اگ آئے گی ہاتھوں میں
ایک بار پھر سزا ملے گی ان ہاتھوں کو
جو پاس بیٹھے بیٹھے پوری کی پوری
صدی کی پیٹھ پر چھرا بھونک چکے ہیں
ایک بار پھر نئی مثالیں گڑھیں گی صدی
اپنے حق میں ـــــ اپنے حق میں

آتما رام

دکھ گاتھا

آتما رام

سروشکتی مان، سروویاپی
ایک دکھ ہے
پسر رہا ہے زمین کے بھیتر صدیوں سے
آہستہ آہستہ
تمھاری تمام کوششوں کو ناکام کرتا ہوا
انسان جان بھی نہیں پاتا
ہزاروں ہزار برسوں بعد بھی
جان بھی نہیں پاتا
دکھ کے سُروت کیا ہیں
دکھ کے سُروت کہاں ہیں
کہاں تک پھیلی ہیں دکھ کی جڑیں
اکٹوپس کی طرح
کس نے دی ہے دکھ کو سہسترِ بھجائیں
کس زمین پر کھڑے ہیں دکھ کے پاؤں
انسان سوچ بھی نہیں پاتا، سوچ بھی نہیں پاتا
کئی کئی ہزار دن گذرے
انسان سکھ کے لیے سنگھرش کرتا آیا ہے
بس سکھ

ایک ماتر
سکھ کے لیے جارز
تمام تمام پر پنج
کہاں چھیڑی ہے انسان نے
دکھ کے خلاف جنگ
کہاں چھیڑی ہے
انسان کے وکاس کا سارا کا سارا اتہاس
سکھ حاصل کرنے کا اتہاس رہا ہے
لگاتار خوش فہمیوں میں رہا انسان
کہ وہ تو واقعی
دکھوں کے خلاف لڑتا آیا ہے ـــــ تمام عمر
بہت ضروری ہے
اب اس بھرم کو صاف کر دینا
ہم میں سے کوئی ہوگا
جو پھر سے چھیڑے گا دکھوں کے خلاف جہاد
جیسے کوئی موت کو جیتنے نکلا ہو
موت کو جیتنے ـــــــــ !!

عبدالرحیم نشتر

ظ انصاری ایک زبردست اور دھانسو قسم کے آدمی مشہور ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ ان سے ڈرتے بھی ہیں عزت بھی کرتے ہیں اور ان سے جلتے بھی ہیں بلکہ بعض تو بغض و عناد رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کسی طرح ظ انصاری ذلیل ہو جائیں۔

بھلا کیوں ——— ؟

ہم نے دور تک نگاہ ڈالی۔ موصوف کا اگلا پچھلا ریکارڈ دیکھا۔ ان کی ادبی رفتار اور معیار و مقام پر نظر ڈالی۔ ان کے اوصاف حمیدہ اور خرافات کا جائزہ لیا مگر کم از کم ہمیں تو کہیں سے نہیں لگا کہ ظ انصاری اتنے خراب آدمی ہوں۔ ہاں وہ ایک ترقی پسند قلم کار ہیں اور کمیونسٹ خیال و نظریہ کے حامی ہیں لیکن خدا کو نہیں مانتے یا انسان کو نہیں گنتے یا انسانیت کی قدروں سے لاتعلق ہیں، ایسا بالکل نہیں۔ پھر بھی ظ انصاری کی ایک ایک بات، ایک ایک خبر موضوع گفتگو بنی رہتی ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اور کہیں نہ کہیں موضوعِ بحث بنے رہتے ہیں۔ ثابت ہوا کہ ظ انصاری ایک ایسے قلم کار ہیں جن کی دھاک چاروں اور ہے وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور ایسے آدمی ہیں جن کی بری بھلی باتوں پر چرچا کرنا اردو دوستوں کا محبوب مشغلہ ہے۔

یہ کریڈیٹ کسی زمانے میں علامہ نیاز فتحپوری کو حاصل تھا۔ ان کے مداح بھی بے شمار تھے اور حاسد بھی۔ علامہ نیاز فتحپوری اپنے دور کی ایک بلند قامت اور قد آور ادبی ہستی تھے۔ ان کی انقلابی شخصیت نے پورے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور وہ ایسے بے رحم نقاد تھے کہ ان کی تنقید کی چھری سے استاذالاساتذہ اور زعمائے ادب جاں بحق ہو گئے۔

ادب میں کچھ ایسا ہی وطیرہ ہمارے ظ انصاری صاحب کا ہے۔ وہ بھی بیک وقت کئی زبانوں

کے ماہر ہیں۔ عالمی ادب کا گہرا مطالعہ، سلجھا سلجھا سماجی اور سیاسی شعور، زبردست صحافتی ادراک، دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ اور ان حالات کے تحت بدلتے ہوئے ادبی خیالات، رجحانات، نظریات اور معیارات پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ چنانچہ جب وہ لب کشا ہوتے ہیں تو ان کی بات جامع اور موثر ہوتی ہے، ان کے یہاں ایک قسم کا ٹھہراؤ ہوتا ہے اور قطعیت ہوتی ہے اور پھر بات کہنے کا جو اسلوب انھوں نے وضع کیا وہ ان کی اپنی ایجاد ہے مرزا اسداللہ خاں غالب کے بعد اردو نثر میں کامیاب ندرت نگاری کا مظاہرہ ڈاکٹر ظ انصاری سے ہی ممکن ہو سکا۔ ان کی زبان انہیں ایک اچھوتی طرز ادا کا قلم کار ٹھہراتی ہے ظ انصاری کی ہر تحریر ادبی ہو یا غیر ادبی اسی اچھوتی زبان اور ندرت مطالب و لہجے سے پر ہوتی ہے اور قارئین پر اپنی مضبوط گرفت قائم رکھتی ہے۔ اس لئے وہ اہلِ ذوق اور زبان و ادب کی ہر سطح کے طبقہ کو اپنا اسیر کرتی چلی جاتی ہے۔ "عالمگیری" کا یہ فن ظ انصاری کے خلاف فضا بنانے میں کارگر ثابت ہوتا ہے اور وہ سارے جغادری ادبی پنڈت جو ظ انصاری صاحب کے آگے پیچھے چل رہے تھے ان کی نمایاں اور زبردست شخصیت کی تاب نہیں لا پاتے۔

ڈاکٹر ظ انصاری نے صرف زبان و ادب پر ہی اپنی چھاپ نہیں ڈالی۔ وہ سماجی اور سیاسی حیثیت سے بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ان کی دور اندیشی اور دور بینی کا یہ عالم ہے کہ انہیں نجومی کہا جا سکے مگر وہ ساری پیشن گوئیاں محض اپنے علم و ادراک کی بنا پر کرتے ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ وہ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے سے مراد اگر ڈاکٹر ظ انصاری جیسی شخصیت کے لئے جائیں تو متعدد اعلیٰ ڈگریاں دھول چاٹتی اور منہ تکتی نظر آتی ہیں۔

سولہ سال کی عمر سے زبان و ادب اور سیاست و صحافت میں لگے رہنے والے ظ انصاری اب اتنے پختہ کار ہو چکے ہیں کہ ان کے اخذ کردہ نتائج بہت کم غلط ثابت ہوتے ہیں اور اندازوں کی ایسی درستگی نے انہیں سیاسی حلقوں میں ایک باوقار مقام عطا کیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور شریمتی اندرا گاندھی ان کی محبوب شخصیتیں رہی ہیں یعنی یہاں بھی ان کے مزاج کی عکاسی صاف صاف ہو رہی ہے۔ ملک و قوم کی اعلیٰ ترین سیاسی شخصیتوں کے علاوہ دوسری اور تیسری صف کے سیاسی حلقے بھی ان کے ارادت مندوں میں شامل ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ان کے بعض معاصرین کو کھٹکتی ہے جس کی وجہ سے ظ انصاری ہمیشہ خبر میں رہا کرتے ہیں

صحافت کے میدان میں ظ انصاری کی جولانیاں بھی قابلِ ذکر ہیں لیکن اپنے مزاج کی یک رخی اور کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرنے کی ضد نے انہیں کہیں ٹکنے نہ دیا "آئینہ" اور "انقلاب" کی ادارت انہیں بے مثال صحافی ٹھہراتی ہیں. مدتوں بعد اردو میں اداریوں کی اہمیت و ضرورت کا احساس ظ انصاری کی تحریروں سے جاگا۔ اور ظ انصاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اداریہ نگاری کو بھی ایک باعزت ایمج عطا فرمائی"۔

"کانٹوں کی زبان" میں ان کے جو منتخب اداریے شائع کئے گئے ہیں ان سے اردو صحافت کا رخ زیبا اور بھی نکھرا ہوا معلوم پڑتا ہے ۔

ذہانت، فطانت، حاضر دماغی، سنجیدگی اور متانت کے علاوہ ان کی خوش فکری اور بذلہ سنجی ایسے نمایاں جوہر ہیں جو بیک وقت ان کی شخصیت کو تابناک بناتے ہیں. نجی ملاقات ہو یا کوئی تقریب و محفل اگر ظ انصاری کے منہ سے کوئی پر مذاق، پر مزاح، شگفتہ اور مہذب یا طنز و مزاح کی چاشنی میں ڈوبا ہوا جملہ نہ صادر ہوجائے تو بات ہی کیا۔ اسی لئے ظ انصاری جس محفل میں ہوں خوب جمتے ہیں اور خوب سجتے بھی ہیں ۔

خطابت، ان کا ہتھیار ہے وہ حسنِ تقریر نہیں جگاتے، منتر مارتے ہیں ان کی تقریر ایک سماں باندھتی ہے. سامعین باذوق ہوں اور ہمہ تن گوش ہوں تو پھر دریا امڈتا چلا جاتا ہے تین تین دن تک علم و ادب اور تنقید و تحقیق کے مختلف پہلوؤں پر سامعین کو باندھے رکھنا کسی زبردست خطیب کا ہی کام ہے اور میں اس ساحرانہ خطابت کا عینی شاہد ہوں ۔

ظ انصاری ایک منفرد ادیب، باوقار نقاد، معتبر مبصر، ہوش مند سیاست داں اور انوکھے اسلوب و دل پذیر لب و لہجے کے قلم کار ہیں ان کے بلند ادبی مرتبہ سے انکار ناممکن ہے. ایسی زبردست خوبیوں اور صلاحیتوں والے قلم کاروں کا ظہور برسوں میں ہوتا ہے۔ عصری ادب کی خوش بختی ہے کہ اسے ظ انصاری جیسے ناقابل فراموش ادیب و انسان کی رفاقت میسر ہے ۔

●●

کتّے

عین دت

دنیا کے ہر خطے میں اور ہر خطے کی گلی کوچوں میں جہاں جہاں مہذب لوگ آباد ہیں کتّے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کتوّں کا تہذیب سے کیا رشتہ ہے یا مہذّب لوگوں کا رشتہ کتوّں سے کیسا ہے اس کا علم تو نہیں مگر ابتدا سے ہی دونوں ساتھ ساتھ دیکھنے میں آئے ہیں۔ کولیرس انسائکلوپیڈیا کے مطابق ان کا وجود دھات کے زمانے سے بھی پہلے کا ہے جہاں کتّے ہوتے ہیں وہاں تہذیب کی نشانیاں پائی جاتی ہیں کتّے سے تہذیب کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے ساتھ کتوّں کو رکھتے ہیں وہ تہذیب یافتہ کہلاتے ہیں۔ جن گلیوں میں کتّے آوارگی کے عالم میں راہ چلتوں کو (دن کی کوئی قید نہیں) طبع آزمائی کرتے ہیں وہ مہذّب لوگوں کا محلّہ کہلاتا ہے۔ جن گھروں کے باہر کتّے بیٹھے محافظ کی شکل میں پہرہ دیتے ہیں وہ گھر تہذیب کا مرکز کہلاتا ہے۔ کہنے کا مطلب کتّا تہذیب کی نشانی ہے۔

یوں تو امریکن کینل کلب Amarican Kenel club نے پالتوں کتوں کو چھ قسموں میں بانٹا ہے مثلاً اسپورٹنگ ڈاگ Sporting dog اسپورٹنگ ڈاگ ہاونڈ۔ Sporting dog hond ورکنگ ڈاگ Working dog ٹریرس Terriers ٹائس Toys نان اسپورٹنگ ڈاگ Non-Sporting dog۔ مگر ہم انہیں دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ شہری کتا (۱) پالتو (۲) غیر پالتو، جنگلی کتا۔

پالتو کتا تہذیب کا پرتیک (نمائندہ) ہے۔ آبادیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسکو وفادار کہتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے کتوں کو تو ہم وفادار کہہ سکتے ہیں مگر کسی وفادار کو ہم کتا نہیں کہہ سکتے۔ اگر بھولے سے وفادار کے معنوں میں کسی کو کتا کہہ دیں تو

وہ جنگلی کتوں کی طرح حملہ آور ہو جاتے گا۔ جس طرح جنگلی کتے چرندوں کے علاوہ بعض اوقات موقعہ ملنے پر انسانوں پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے ہیں وہ بھی کتا کہنے والوں کی جو کہ دفا کی علامت ہے بوٹی بوٹی نوچ کھانے پر تل جاتا ہے۔

کتے کے کئی نام ہوتے ہیں لیکن ہندوستان میں عموماً موتی اور بیرون ہند میں ٹامی یا جانی کے نام سے اکثر جانا جاتا ہے ویسے اکثر یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ہر گلی، محلے، نگر یا حلقہ علاقے میں تہذیب انسان ضرور رہتا ہے جس کا دبدبا پورے محلے والوں پر آسیب کی طرح طاری رہتا ہے اس کا اصلی نام تراہ کچھ بھی ہو مگر عرفاً موتی، جانی، ٹامی، جگا، منا، ٹائیپ کے نام ضرور رکھتا ہے شاید یہ اس کی آبادوفاداری کی دلیل ہے وہ بھی محافظ ہوتا ہے

پالتو کتوں کی پرورش امراء کے بچوں کی طرح ہوتی ہے کھانے کو بسکٹ، کیک، مٹن، مچھلی اور ہڈیاں ملتی ہیں جبکہ غریب بچوں کی طرح غیر پالتو کتے خود پرورش پاتے ہیں۔ اکثر سڑک پر پڑی ہوتی جھوٹی چھاٹی، سڑی گلی چیزوں سے پیٹ بھرتے ہیں پالتو کتے کے گلے میں بھونکنے کا لائسنس ہوتا ہے وہ پیدل کم گھومتے ہیں عموماً لوگ انہیں گود میں لے کر ٹہلاتے ہیں یا کار میں بیٹھا کر سفر کرتے ہیں۔ اس کے کاٹنے پر کسی کو نقصان نہیں پہنچتا صرف ۱۴ انجکشنوں کا ایک کورس کرنا پڑتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہوتی۔ جس طرح کسی بارسوخ آدمی کے نقصان پہونچانے پر عام آدمیوں کی عدالتوں میں رسائی کم ہوتی ہے۔ جو کتا جتنی بڑی کار میں گھومتا ہے وہ تہذیب کا اتنا ہی بڑا نمائندہ کہلاتا ہے۔

پالتو کتوں کے کئی رنگ روپ ہوتے ہیں۔ جغرافیائی ماحول اور اسکے طبعی اعتبار سے ان کی جسامت ہوتی ہے ان میں سب سے پیارا سفید رنگ اور بونے قد کا کتا ہوتا ہے یہ نسل ٹائسی ہوائے کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے پومرینین Pomornian بھی کہتے ہیں۔ اسے دوشیزائیں عموماً اپنے سینوں سے لگائی رکھتی ہیں۔ جسے دیکھ کر بے شمار نوجوانوں کا خون دل جلتا ہے اور دل میں معشوق کا کتا ہی بن جانے کی تمنا پروان

پر جسے مٹی ہے یہ کتا کم وزن یعنی ۱۰ پونڈ کا ہوتا ہے۔ مگر اس میں بلا کی چستی اور چالاکی ہوتی ہے۔ یہ گھر کی رکھوالی کا کام بھی انجام دیتا ہے سب سے خوفناک شکل اور جسامت کا کتا جس کو دیکھ کر روح فنا ہونے لگتی ہے وہ بل ڈاگ کہلاتا ہے اس کے جبڑے لٹکے اور پھیلے ہوتے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے اس کے دل کا ایک گوشہ بڑا نرم ہوتا ہے۔

پالتو کتوں میں بھی انسانوں کی طرح تفریق پائی جاتی ہے۔ ایک نسل کا کتا دوسری نسل کے کتوں پر آوازے کستا ہے ایک گلی کا کتا دوسری گلی میں کتا اور اپنی گلی میں شیر بنا رہتا ہے۔ گلی سے اکیلی کتیا کا گذرنا دشوار ہوتا ہے ایک کتی کے پیچھے کئی عاشق کتے اپنے عشق کی داستان سناتے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ اس منظر سے ہمارے نوجوانوں نے اکثر تحریک پائی ہے۔

پالتو کتوں میں ڈیموکریسی کے جراثیم کثرت سے پائے جاتے ہیں ان کے یہاں اظہار خیال پر کسی طرح کی پابندی نہیں ہوتی۔ اقلیت کا نمائندہ بھی اتنی ہی زور و شور سے اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے جس طرح ایک اکثریت کا نمائندہ کرتا ہے۔ ان میں کوئی لیڈر نہیں ہوتا اس لئے یہ اپنی ڈسپلین آپ مینٹین Maintain کرتے ہیں۔ ان کے گلوں میں زنجیر ہونے کے باوجود وہ اپنے اظہار خیال سے نہیں گھبراتے میرا خیال ہے ان کا اگر کوئی پریس ہوتا تو اس میں وہ اپنے احساسات کا اظہار بے باکی سے کرتے۔ اپنے حقوق کے مطالبے پر کچھ زیادہ زور و شور سے اپنی آواز بلند کرتے

کتوں کی خصلت کے بارے میں لوگ انھیں خواہ مخواہ رسوا کرتے ہیں اگر سچائی اور گہرائی سے ان کی خصلتوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کتوں کے چند اوصاف انسانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی اچھی چیز کو دیکھ کر کتے کی رال ٹپکنے لگتی ہے اور اس کی دُم زور زور سے ہلنے لگتی ہے انسانوں میں بھی کچھ خوشامد پسند اور لالچی اپنے مفاد کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگتے ہیں مطلب کے تحت کتے کی دم کے مانند آگے پیچھے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ خیر میرا مقصد موازنہ نہیں اس لئے اسکو یہیں چھوڑ دیتا ہوں ورنہ مضمون طویل ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ خلافِ موضوع اور بے مقصد ہے

کتے عموماً پالا جاتا ہے گھر کی چوکیداری کرتے ہیں مگر وہ زمانہ ہوا ہوا جب کتے صرف چوکیدار ہوا کرتے تھے ورکنگ ڈاگ کی کیٹگری اس بات کی دلیل ہے کہ کتے ہر قسم کا کام کرسکتے ہیں۔ اسکیمو Eskimo نسل کے کتے سلج sledge کھینچتے ہیں کولی collie نسل کے کتے میدانوں میں بکری، بھیڑ، گائے بھینس، بیل کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بھارتیہ کتے بھارتیوں کے مانند کاہل ہوتے ہیں۔ مگر ہم ان کے لئے تمام کتوں کی نسلوں کو تو برا نہیں کہہ سکتے۔ ورکنگ ڈاگ میں ایک شیفرڈ نام کا کتا بھی پایا جاتا ہے جس کو عام زبان میں پولس کا کتا کہا جاتا ہے۔ یہ بھیڑیا شکل مگر چھوٹے قد کا کتا ہوتا ہے جب راتوں کو شہری گشت لگانے والے محافظ کتوں کو نیند آنے لگتی ہے یا ان کی نیند لگوائی جاتی ہے تب شہری واقعات کی تفتیش کیلئے ان کی مدد حاصل کرنی پڑتی ہے یہ انٹلیجنس Intalliyunce کا کام انجام دیتے ہیں۔ بڑی چالاکی پھرتی اور تیزی سے چور، ڈکیت اور خونی و دیگر جرائم پیشہ دردں کو پکڑتے ہیں۔ کتے میں ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کتا رشوت نہیں لیتا اگرچہ چوروں کے پاس ہر قسم کی ہڈی ہوتی ہے مگر انٹلیجنس کتوں کے آگے اس ہڈی کی ایک نہیں چلتی۔

پچھلے دنوں ایک خبر پڑھنے کو ملی تھی کہ کتے کو راکٹ میں بیٹھا کر کسی سیارہ پر بھیجا گیا تھا۔ واقعی اس کتے کی تقدیر پر رشک ہوتا ہے مگر مجھے یقین ہے اس کو ضرور تکلیف ہوئی ہوگی کیوں کہ اونچائی سے ہماری بھکمری اور غریبی صاف دکھائی دی ہوگی۔ شاید اسی لئے واپسی پر اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار بھونک کر کیا تھا مگر کسی نے اپنے آگے اسکی ایک نہ سنی۔ خیر اوروں کی بات سنا دینے بھی ہماری فطرت کے خلاف ہے۔

چینی نسل کا کتا چاؤں چاؤں chow chow اپنی خصوصیات میں منفرد اور ممتاز ہے یہ ایک واحد قسم کا کتا ہے جسے ون مینس ڈاگ یعنی ایک آدمی کا کتا کہا جاتا ہے۔ یہ کتا بچپن سے جسکے پاس پلتا ہے اسی کا ہو کر رہتا ہے

جب کہ انسانوں کے بچے بڑے ہو کر اپنے ماں باپ سے ہٹ کر جاتے ہیں۔ انہیں پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ انتہائی وفا شعار ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس کی ہی مٹی سے شاید مجنوں، فرہاد، رانجھا، رومیو اور مہیوال وغیرہ کو بنایا گیا تھا۔

کتوں کی نسل ہاؤنڈ Hound میں ایک کتا بلڈ ہاؤنڈ Blood hound بھی ہے۔ یہی ایک دنیا کی واحد نسل ہے جسکی گواہی عدالتوں میں مستند مانی جاتی ہے اس کو شہادت دینے کیلئے گیتا، بائبل، قرآن یا دیگر مقدس کتابوں پر ہاتھ رکھ کر یا خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ بیان دینے کی ضرورت نہیں پڑتی یہ ان تمام شرائط سے مستثنیٰ ہوتے ہیں ویسے بھی یہ سچ بولنے کے لئے کسی سہارے (قسموں) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقل تو یہ بھی کہتی ہے کہ یہ تمام سہارے جھوٹ اور جھوٹ کو وزن دار سچ بنا کر پیش کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔ کتے بھلا انسان تھوڑے ہی ہیں جو جھوٹ بولیں گے۔

جنگلی کتے عموماً جنگل میں پائے جاتے ہیں یہ بھیڑیئے کی شکل اور مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ اگر مہذب نہیں کہلاتے مگر ان میں تہذیب کے آثار مہذب لوگوں سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ سماجی زندگی گذارتے ہیں۔ غول کی شکل میں جیتے ہیں ان کا ایک رہنما ہوتا ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے ہر مہم میں پیش پیش رہتا ہے جب کہیں حملہ کرنے کا وقت آتا ہے تو اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں وہ پیچھے کھڑا ان کی کارگذاری کا جائزہ لیتا ہے کسی کو لاپرواہی یا سستی کی سزا اسی کے حکم سے تمام کتے مل کر دیتے ہیں۔ ان کی ایکتا اور اتفاق کو دیکھ کر جنگل کا راجہ بھی گھبراتا ہے۔ جبکہ یہ اوصاف پالتو کتوں میں تو کیا انسانوں میں نہیں پائے جاتے۔ انھیں اوّل تو ایک اچھا رہبر نہیں ہوتا اور بھول سے کہیں نظر آنے لگتا ہے تو اس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ پھر بھی جنگلی کتے غیر مہذب اور جنگلی کہلاتے ہیں۔ یہ بھی عجیب بات ہے۔

●●

کچھ نظام الدین نظامؔ پر

نظامؔ جدید شعراء کے اس گروہ سے متعلق ہیں جو سنہ ء کے بعد اچانک ہٹ ہوتے اور پھر کسی پرانی فلم کی طرح بھلا دیے گئے۔ مگر نظامؔ اپنے منفرد رنگ اور متوازن لب و لہجے کی وجہ سے ذہنوں میں محفوظ ہی نہیں رہے بلکہ یاد بھی کیے جاتے رہے ہیں۔ اپنے اردگرد پھیلی وسیع دنیا کے مسائل اور تغیرات سے گہری آگہی اور طرزِ بیان کی ندرت نے انھیں معاصرین میں نمایاں مقام عطا کیا ہے اور وہ شعراء کے اس گروہ میں بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ ان کے معاصرین زیادہ تر "اخباری" اور "مکتبی شاعری" کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئے ہیں اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے ہیں مگر نظامؔ نے اپنا سفر کڑی دھوپ میں بھی جاری رکھا۔

برسوں پہلے ان کا اوّلین شعری مجموعہ "لاشعور" منظرِ عام پر آیا اور داد و تحسین حاصل کر چکا۔ نظامؔ شعور اور لاشعور کے شاعر ہیں، اپنے گرد و پیش کے گہرے شعور و ادراک نے انھیں زیادہ معتبر بنا دیا ہے۔ ان کی شاعری میں عصری حسیّت کا بھرپور رچاؤ ملتا ہے۔ شاعر اپنے خارجی ماحول، سماج، معاشرے اور اپنے دور کے نشیب و فراز سے باخبر ہے اور روحِ عصر پر ان کی گرفت مستحکم ہے۔ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات، شدّت، تضاد کے باوجود نظامؔ قنوطی نہیں ہوتے۔ مگر تنا انھیں جھنجھلاہٹ کی چوکھٹ پر لا کر ضرور کھڑا کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ نظام زندگی کو فن کے وسیلے سے دیکھنا تو چاہتے ہیں لیکن فن کے مروجہ فارمولوں اور بندھے ٹکے اصولوں کی عینک سے نہیں، وہ ادب میں توڑ پھوڑ اور تجربات کے قائل ہیں۔

نظامؔ کے کلام میں رجائی عناصر بھرپور مل جاتے ہیں اور زندگی جینے کے بشارتیں بھی، مستقبل کی جھلکیاں بھی اور یہ سب ان کے صحت مند شعری رویّے کا خبرنامہ ہے۔ زبان و بیان کا دروبست، اظہار کی گرفت اور صلابت، لہجہ کی توانائی اور طنطنہ، نفسیاتی عناصر کا بہاؤ، واردات قلب کی سرگزشت، طنز کی کاٹ، جذبے کی شدّت، ایسی علامتیں ہیں جو نظامؔ کی پہچان اور شناخت ہی نہیں بلکہ ان کے قادر الکلام شاعر ہونے کا اعلامیہ ہے

ادارہ تکمیل نظام الدین نظامؔ کے فن اور شخصیت پر ایک گوشہ مرتب کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ امید ہے ہمارا یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔

غزلیں

نظام الدین نظام

ستارے ریشمی دامن میں آنکھوں سے اترتے ہیں
شبِ مہتاب جیسے جھیل میں بجرے اترتے ہیں

ابھی اے فکرِ فردا، ذہن کے در پر نہ دستک دے
تصوّر کی زمیں پر لوگ ماضی کے اترتے ہیں

کبھی اک ذہن کی شرکت سے ہر محفل گلستاں ہے
کبھی اک دل کی کہتے ہی کئی چہرے اترتے ہیں

مگر ہر بار میرا فیصلہ نقصان کا سودا
مگر ہر بار اندازے مرے پورے اترتے ہیں

پرندے توڑ دیتے ہیں ہری شاخوں کی زنجیریں
سحر ہوتے ہی سائے بھی درختوں سے اترتے ہیں

ہمیں تپتے ہوتے صحراؤں کو سیراب کرنا ہے
ہم ابرِ تر سہی لیکن ذرا نیچے اترتے ہیں

لہو اک کشمکش بن کر اتر آتا ہے آنکھوں میں
ہرن کے جسم میں جب شیر کے پنجے اترتے ہیں

میں اکثر نیند کی راحت غزل کی نذر کرتا ہوں
فلک سے نیم شب اکثر فرشتے اترتے ہیں

۹۴، برکت علی دیرانی مارگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

مار ڈالا خوف کو لیکن خطر رہنے دیا!
سانپ کے ٹکڑے کیے اور اس کا گھر رہنے دیا

●

ناپسندیدہ تعلق ذہن کا ناسور تھا
میں نے دردِ دل لیا اور دردِ سر رہنے دیا

جب بہت اکتا گیا دانستہ اپنے آپ کو
شہر کی سرگرمیوں سے بے خبر رہنے دیا

یا اچھالا یوں کہ اک تحریک بن کر رہ گیا
یا نظریہ مصلحت کی طاق پر رہنے دیا

اک بجز دستِ ہنر سب چور اٹھا کر لے گئے
پھر لیا ہی کیا اگر دستِ ہنر رہنے دیا

بھائیوں میں بانٹ کر ورثہ بزرگوں کا تمام
شاعری کا قرض میں نے اپنے سر رہنے دیا

●

حسن سلیقہ کھو بیٹھے گا [illegible] سے آنکھ چرائیں گے
ٹیڑھے میڑھے سب آئینے شائستہ کہلائیں گے

شعر، ہنر، تصویر، تعارف، ڈھول، کہانی، موسم، آگ
بستی بستی گھوم کے سادھو جھولی میں بھر لائیں گے

الٹی سیدھی چالوں سے اب کوئی رستہ نکلے گا
کچھ لوگوں کو رام کیا کچھ لوگوں کو بہکائیں گے

شوہر سے بیوی کا رشتہ مہمانوں کی خاطر ہے
گھر کی دیواروں پر ننگی تصویریں لٹکائیں گے

یار نظام الدین ہمیشہ اس کی باتیں کرتا تھا
ہم بھی اپنے ہونٹوں کو اس ناگن سے ڈسوائیں گے

زمیں سبز تھی، رنگین آسماں تھا اُدھر
مجھے بھی یاد ہے خوابوں کا ملک جہاں تھا اُدھر

غبارِ خواب اِدھر تھا، اُدھر دھواں ہی دھواں
اِدھر میں خاک بسر تھا اور آسماں تھا اُدھر

ہمارے بعد تو سب کچھ بدل دیا تم نے
وہ آفتاب اِدھر تھا، یہ سائباں تھا اُدھر

وہ میرا گھر نہیں تنہائی کا جزیرہ تھا
اداسیوں کا سمندر رواں دواں تھا اُدھر

مرے مزاج کو تبدیلیاں ہی راس آئیں!
سکوتِ مرگ اِدھر ہوں کہ داستاں تھا اُدھر

نہیں تھی ڈول میں رسّی، نہ بازوؤں میں سکت
لبوں پہ پیاس کے دھارے تھے اور کنواں تھا اُدھر

نظامؔ عقل کے دھندے میں کب ہوا گھاٹا!
مگر وہ سود بھی میرے لیے زیاں تھا اُدھر

آنکھوں کے واسطے نئی الجھن سڑک پہ ہے
کھڑکی میں صرف سایہ ہے ساجن سڑک پہ ہے

بچوں کو گھر میں دیکھ کے خدشات مٹ گئے
بے راہ روی کا جو بھی ہے کامن سڑک پہ ہے

گلیوں میں چارپائیاں بچھنے لگی ہیں اب
لوگوں کا فیصلہ ہے کہ آنگن سڑک پہ ہے

کمروں میں ناچتی ہیں ہوس ریز خوشبوئیں
پھولوں کی ٹوکری لیے مالن سڑک پہ ہے

بچے چبا رہے ہیں پرانی کہانیاں
چولھے میں بھوک جلتی ہے، راشن سڑک پہ ہے

زندہ ہے تو نظامؔ تو دریا قریب ہے
اور قتل ہو چکا ہے تو مدفن سڑک پہ ہے

لوں میں خوشبوئیں نہیں، ہوا کہاں چلی گئی
یام کس کے پاس دوں، صبا کہاں چلی گئی

ہو میں غرق کیوں ہوا ہر ایک موج کا بدن
ھی جو اس کے ہاتھ سے حنا کہاں چلی گئی

زر گئی سروں سے یا بکھر گئی خلاء خلاء
یں سوچتا ہی رہ گیا، صدا کہاں چلی گئی

چمک رہا ہے دور تک مفاہمت کا راستہ
طلب کی رہنمائی میں انا کہاں چلی گئی!

میں خواہشوں کی یہ بہشت پھونک دوں: مگر نہیں
کبھی جو دل ہی پوچھ لے بتا: کہاں چلی گئی

درِ قبول سے اِدھر بھٹک رہی ہے عرش پر
میرے لبوں کو چھوڑ کر دعا کہاں چلی گئی!

ادھر ہیں وہ نقوش جو مثالِ مہر و ماہ تھے
تمہیں کہو، سلف کی وہ عطا کہاں چلی گئی!

نظام اب کدھر گئی مزاج کی وہ نازکی
بدن پہ تھی جو ریشمی قبا، کہاں چلی گئی

تکملہ

حیرت اور اضطراب کو ہم سفر کروں گا میں
دیکھوں گا تجھ کو، آنکھ کو پتھر کروں گا میں

وہ دل نشیں گناہ تری یاد ہی تو ہے
توبہ کے بعد بھی جسے اکثر کروں گا میں

سانپوں کو دوستوں سے بھی ڈسواؤں گا کبھی
دیکھو گے یہ تماشہ سڑک پر کروں گا میں

منتر کبھی پڑھا تو وہی زد میں آئے گا
جادو کبھی کیا تو اُسی پر کروں گا میں

لوگوں کو ایک شام دِکھاؤں گا معجزہ
سائے کو اپنے قد کے برابر کروں گا میں

آندھی کو اوڑھ لوں گا ضرورت اگر پڑی
تپتی ہوئی چٹان کو بستر کروں گا میں!

غالب کے بعد اردو غزل مر گئی نظام
مُردے پہ ایسا کون سا منتر کروں گا میں

یہ آگ روشن تمام شب تھی

یہ آگ میرے لہو میں ہے
جو مرے بدن کو جلا رہی ہے
یہ آگ پانی میں بہہ رہی ہے
لہو بدن کی زمین پر سر پٹک رہا ہے
کہ جیسے رگ رگ چٹخ رہی ہے

یہ آگ جس میں
لہو کے ذرّے یوں ٹوٹتے ہیں
اداس راتوں میں جیسے تارے
فلک کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہیں

یہ آگ کرنیں لٹا رہی ہیں
کہ جیسے میرے لہو کی ہر بوند
ایک سورج اگا رہی ہے
تمام منظر چمک اٹھے ہیں
شکستہ شعلوں کی حدتوں سے دہکتی وادی میں
گرم جھونکے ہوس کی آتش جگا رہے ہیں
کہ رات آنسو بہا رہی ہیں

سحر کی نم ساعتوں میں لیکن
کواڑ، کھڑکی، کتاب، بستر
گواہی دیں گے
کہ رات تاریکیوں کے گہرے سمندر میں اتر چکی تھی
تمام سمتیں غریقِ ظلمت
تمام منظر سیاہ رو تھے
مگر لہو کی یہ آگ روشن تمام شب تھی
بدن کے ویران کھنڈروں میں جیسے
تجلّیوں نے پناہ لی تھی
وقارِ شب تھی یہ آگ جس نے
لہو کو تابندگی عطا کی
چراغِ شب تھی
یہ آگ، روشن تمام شب تھی

کوئی بار نہیں

کھلی جو آنکھ تو افلاس کا تسلط تھا
کھلا کہ میرے لیے بس
بنام توشہ نیازیں تھیں اور تبرک تھا
کہ میرے فقر پہ معصومیت کے سائے تھے
فقیرِ شہر تھا' فاقے مری بشارت تھے
بہت غنیمت تھے
کہ آرزو کی غلامی کی اس اذیت سے
نہ کوئی رشتہ مرا اور نہ کچھ علاقہ تھا
مرے انگوٹھے میں چھلا تھا بے نیازی کا
تھا میرے ہاتھ میں چمٹا تھا دعا درازی کا

شعور جنما تو لی خواہشوں نے انگڑائی
مری قبا کو کیا تار تار جذبوں نے
مرے لہو کی حرارت نے میرے چھلے کو
گھمایا یوں کہ مرے ہاتھ سے گرا چمٹا
اجالے روح کے
غبارِ بدن میں دفن ہوئے
تمام توشے' نیازیں' تمام نذرانے
(کہ جن سے نفرت تھی)

وہ اب ضرورت ہیں
عقیدتوں کے غلافوں کو اب طلب کی ہوا
اڑا اڑا کے جھڑکتی ہے رنگ لالچ کا
نگاہیں اپنے ترازو میں تولتی ہیں انھیں
مرے ضمیر کو یوں شرمسار کرتی ہے
شکم کی آگ ہی فاقے شمار کرتی ہے

فقیرِ شہر ہوں اور بے ضمیر جیتا ہوں
عجب نشہ ہے طلب کی شراب پیتا ہوں
مگر یہ شہر سمجھنے سے مجھ کو قاصر ہے
ہر ایک شخص نیا غم اٹھائے حاضر ہے
تو پھر طلب کا مری ان کے غم سے رشتہ ہے
یہ بوجھ ہلکا ہے
اسی لیے تو اٹھانے سے مجھ کو عار نہیں
یہ میرے فقر کے کاندھوں پہ کوئی بار نہیں

●

ارتکاب

ڈھلتے سورج سے پوچھ ہی بیٹھا
موت کا خوف کیسا ہوتا ہے — ؟
اُس نے شہر سمیٹ کر اپنے
تان دی کالی رات کی چادر
اور مجھ سے کہا کہ: اب سوچو
موت کا خوف کیسا ہوتا ہے ؟

افلاس

مفلسی کا سورج جب
گھر کی چھت پر اترا تھا
پیڑ اپنے آنگن کا!
ہم نے بیچ ڈالا تھا
دھوپ اب مقدر ہے

خوش گمانی

ذات کے کنویں میں ہے
ڈول خوش گمانی کا
پانیوں کی سازش ہے
مینڈکوں کو سانپوں نے
راز پر لگایا ہے
آنے والا ہر لمحہ
سامنے کا منظر ہے
پر، انا کی آنکھوں پر
جھلیوں کا پردہ ہے
اپنی موت مرنا ہے

دعا

مجھے حوصلہ دے میں آسمانوں کی جانب سفر کر سکوں
مجھے حوصلہ دے کہ میں بھی کسی دن
بدن سے نکل کر
ہواؤں کی کشتی پہ ہو کر سوار
سمندر کے سینے پہ چلتا ہوا
تیرے پاس آجاؤں پروردگار
مجھے آج تیری ضرورت ہے مولا
طبیعت میری آج گھبرا رہی ہے
اگر حاضری کی اجازت ہے مولا
تو میں اس زندگی کی کشش توڑ دوں
اسے چھوڑ دوں

لاحاصل

نبض گننے لگے ہو اپنی ہی
دھڑکنیں بھی شمار کرتے ہو
زندہ رہتے ہوئے بھی مرتے ہو
اس رویّے سے صاف ظاہر ہے
آج کل خود سے پیار کرتے ہو

تو پھر سماعت کیا!

کبھی کبھی یہ خوشی جو بات کہتی ہے
زباں تو کیا ہے
اُسے دھڑکنیں بھی کہہ نہ سکیں
مگر وہ بات
خوشی جسے بیان کرے
ہماری شور گزیدہ سماعتوں کے لیے
بس اک اشارہ ہے ـــــ ایسا
کہ جس کو دیکھ تو سکتے ہیں، سن نہیں پاتے
تو پھر سماعت کیا!

سرفرازی

اُلجھ گئی اگر نئے برگد کی بوڑھی شاخوں سے
تو اُس پتنگ کی قسمت کا فیصلہ معلوم
وہی پتنگ بڑی سرفراز ہوتی ہے
کہ جس کو
گلی کے یہ بچّے لوٹ لیتے ہیں

کم ظرف

دوستی پیرہن بدل کر جب
بے ضرر دشمنی میں ڈھلتی ہے
وسوسے دوریوں کے کیچڑ میں
ایک نوزائیدہ کنول کی طرح
پھولتے پھلتے ہیں جسارت سے
وہ جسارت ـــــ کہ جس کی
شہ پاکر
نفرتوں کا یہ دلدلی کیچڑ
اپنے ہونے پہ ناز کرتا ہے

تجدید

کھلونے بیچنے والا میرے محلے میں
نہ جانے کتنے برس سے صدائیں دیتا ہے۔
مجھے تو اس کی صداؤں کی عمر یاد نہیں
پر اتنا یاد ہے مجھ کو
کہ جب میں چھوٹا تھا
کھلونے دیکھ کے ہر بار میری آنکھوں میں
جو چمک رقص کرنے لگتی تھی
وہی چمک تھی
وہی اُن چھوٹی سی کرنیں تھیں
کھلونے بیچنے والے کی بالغ آنکھوں میں
------ کھلونے ٹوٹ چکے
اب نقوش باقی ہیں
کھلونے والا مگر اب بھی
جب محلے سے گذرتا ہے
مرے نویدؔ[1] کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں
(یہ واقعہ ہی نہیں ہے اصولِ فطرت ہے)
مگر یہ حیرت ہے
نہ جانے کیسے ابھی تک
کھلونے بیچنے والے کی بوڑھی آنکھیں بھی
میرے نویدؔ کی آنکھوں کا ساتھ دیتی ہیں

عجیب شب ہے

یہ کیسی شب ہے
کہ ایک شب میں تمام عالم بدل گیا ہے
تمام منظر
جو کل تک اک مہیب نقشہ بنے ہوتے تھے
اب ایک صورت میں ڈھل رہے ہیں
یہ ایک صورت وہی ہے
جس کی تمنا لے کر
میں اپنی آنکھوں کو آئینوں میں چھپا چکا تھا
یہ شام ایسی سلونی صورت
جو میرے پہلو میں ڈوبنے کو مچل رہی ہے
وہی ہے جس کو میں روز خوابوں میں دیکھتا تھا
مگر مجھے یہ خبر نہیں تھی
کہ میرے ہاتھوں کا لمس پاکر
تمام عالم کو ایک شب میں
وہ روشنی بخش دے گی جس سے
تمام عالم چمک اٹھے گا
عجیب شب ہے
تمام عالم چمک اٹھا ہے
تمام عالم بدل گیا ہے
عجیب شب ہے

---

[1] نوید میرے لڑکے کا نام ہے۔

نظامؔ کی شاعری ــــــ منی اور میڈیم شعریات

عزیز قیسی

برادرِ عزیز نظام الدین نظامؔ کی عمر اور میری عمر میں کئی دہوں کا فرق ہے (کم از کم دو دہوں کا تو ہوگا) ان کی شاعری پر ان کے کسی ہم عمر، ہم نشیں، اور ہم سر سے لکھوایا جاتا تو ان کے حق میں حوصلہ بخش ہوتا۔

یہ کچھ منی اور میڈیم سائز کی نظمیں اور غزلوں کے کچھ منتخب اشعار، جو آپ نے بھیجے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوئی کہ یہ سب کے سب ایک ہی انداز، ایک ہی طرزِ بیان اور ایک ہی معیار کے آتے ہیں۔ لاشعور کے بعد دس برسوں میں کیا اتنا ہی فرق نظامؔ کے لہجے میں آیا ؟ پر اب ان کا "ڈکشن" ایک متوسط طبقے کے پڑھے لکھے اردو داں نوجوان کا "روزمرہ" اور محاورہ بن گیا ہے جس میں کچھ ادبی اصطلاحات، کچھ انگریزی لفظ ـ ـ ـ ـ شامل ہیں۔

شاید نظامؔ نے یہ نظمیں، اور اشعار اس نقطۂ نظر سے چنے ہوں کہ انھیں وہ بہترین سمجھتے ہوں۔ بہتر ہوتا کہ ان کا سارا کلام مرے سامنے ہوتا۔ یا کوئی اور شخص ان کی شاعری پر لکھتا، جو اُن سے اور ان کے کلام سے، بہتر طور پر واقف ہوتا

نظامؔ کو اس دہے کے ابھرتے ہوئے شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جنھیں آپ Post modern دور کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ جدیدیت کی گرد Settel ہو گئی ہے۔ حالاں کہ ان کے دو مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔

نظامؔ، نظم اور غزل، دونوں اصناف میں "کلام" کرتے ہیں۔ میں نے کلام کرنا خاص طور

۲۶ عثمان چیمبرس، کشور کمار لین، جوہو، بمبئی ۴۰۰۰۴۹

پر لکھا ہے۔ ان کے شعر کہنے اور شعر سنانے اور گفتگو کرنے کا انداز ایک سا معلوم ہوتا ہے۔ یا اسے یوں طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بات چیت بھی کلام کی طرح کرتے ہیں۔ کلام بھی بات چیت کی طرح لکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات چیت یا کلام' عام نوجوانوں کی بات چیت سے مختلف ہے۔ یہ ایسے نوجوان کی بات چیت ہے جو اردو کے صرف و نحو سے واقف ہے اور اپنی زبان کو معیاری زبان عادتاً اور اس زبان میں' ادبی اصطلاحات ارادۃً شامل کیے ہوئے ہے۔

بلاناغہ ہم لوگ ملنے لگے ہیں
مگر سابقہ تجربے بھی ڈراتے ہیں مجھ کو (تعلق خاطر)

ذات کے کنویں میں ہے
ڈول خوش گمانی کا (خوش گمانی)

اس معیاری ادبی بول چال کی زبان میں لفظ۔ غیر شاعرانہ'۔ مگر صرف و نحو کے پابند غیر روایتی مگر "جدیدیت" کے کلیشیز کے قریب بڑی بے ساختگی سے استعمال ہوتے ہیں۔

تعلقات مسائل کو جنم دیتے ہیں
یہ کوئی قول نہیں ہے' محاورہ بھی نہیں
نہ جانے کیسے تعلق ہیں جن کے نطفے سے
یہ سرخمیدہ مسائل فروز ہوتے ہیں (میرا مزاج)

جنگلوں کی سمت سے آوازِ دف آنے لگی
کیا اساطیری بلا گھر کی طرف آنے لگی

شاعری مشغلہ نہیں ہے مگر
یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں

اک علامت ہے یہاں قبر برائے ترسیل؟
اور اس قبر کو شاعر کا مکاں ہونا ہے !!

چمک رہا ہے دور تک مفاہمت کا راستہ
طلب کی رہ نمائی میں انا کہاں چلی گئی

فن سے صدقِ نقد کی عظمت کا رشتہ اور ہے
ناقدِ محتاج سے حاجت کا رشتہ اور ہے

ریڈیو وانی ہوا کی، ٹی. وی درشن دور کا
اور جو کاغذ سے ہے شہرت کا رشتہ اور ہے

اور اس رواں دواں بات چیت میں جن میں اصطلاحات اور تنقید و تبصرے ' کلیدی لفظ ' جواب گھستے گھستے ' کلیشے بن گئے ہیں اور ان کے معنوں کی پرچھائیاں سمٹ سمٹا گئی ہیں۔ وہ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ جن میں کہیں کہیں — دو چار جھٹکے بھی۔ قاری (یا سامع) کو لگتے ہیں۔ !! منیہ رندیہ ! مکمل ویسا ہی ہے جیسا کہ ترقی پسند مصنفین کے مینی فیسٹو کو شاعر نظم کیا کرتے تھے

شام آ ہوتے ہی کتنے زاغ و زغن
بیٹھ کر بام پر ساعت کے — !
دُم اٹھاتے ہیں بیٹ کرتے ہیں

اپنی سماعت کے آئے دیمک
لفظوں کے بھوکے جھینگر
آ دُاس کو کھا جائیں

کہیں کہیں، لیکن — نامانوس شعری زبان ایک جھنکار بھی پیدا کر جاتی ہے، جو ایک خاص

تکیل

قسم کا لطف بھی پیدا کرتی ہے۔

پانیوں کی سازش ہے
مینڈکوں کو سانپوں نے راہ پر لگایا ہے
قدم رکھتے ہی جیسے کھل گیا دلدل میں دروازہ
عجب کاریگری دیکھی یہاں مٹی میں پانی کی
بچے کی ضد یہی تھی کہ کھائیں گے ساتھ میں
میں نے کہا کہ دیر سے آؤں گا رات میں
.... کلمات طفل کلمۂ ایمان بن گئے

لفظ کلمات طفل کلمۂ ایمان بن گئے۔ یہ لفظ بے محابا بغیر نوٹس دیے آتے ہیں۔ اِن کا اچانک نادر ابہام۔ لیکن۔ مزہ دے جاتا ہے۔

کلامِ نظام ایسا نہیں ہے کہ۔ اس مزے سے یا رس سے کم کم بہرہ مند ہے۔ یہ جو آج کے اورسے کا انہیں محاورہ ہے۔ لیکن ایسی ذہانت سے ایک ہو کر ایسی ہی لذت آمیز "حیرت سے چار کرتا ہے۔

سا بہت چھوٹی نظم ہے "عیادت"

حضور علم و بصیرت ہوا ہوں
میں حاضر
مگر عیادت کو

دوسری مختصر نظم افلاس دیکھیے۔

مفلسی کا سورج جب
گھر کی چھت پر اترا تھا
پیڑ اپنے آنگن کا
ہم نے بیچ ڈالا تھا

ر غزل میں ~~ــــ~~ زمیں میں کس نہیں ہو تو گھٹائیں خون روتی ہیں۔
ہر حرف میں رس نہیں ہو تو شعر اچھا نہیں لگتا

ہم آنسوؤں میں نہیں دھڑکنوں میں جیتے ہیں
مگر وہ آنکھ سے دل تک سفر نہیں کرتے

نظام الدین نظامؔ کا لفظیات کا یہ برتاؤ، یقیناً ایک اپنی علیٰحدہ شناخت کی شعوری کوشش ہے۔ ان کے ۱۹۸۳ء کے مجموعۂ کلام "لاشعور" میں اس کوشش کے آغاز کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار میں

غزل کہنا نظامؔ اپنے لیے مشکل نہیں لیکن
جسے سب شعر کہتے ہیں بڑا دشوار ہے بھائی

کھیل ہے الفاظ کا معنی کی پرکاری سمجھ
یا غزل کو قافیوں کی ناز برداری سمجھ

مقبولیت ہی فن ہے تو فن کار ہے بڑا
شہرت کے اعتبار سے شعلے کا کالیہ

آپ کو بھی لوگ گردانیں گے دانش ور نظامؔ
آپ بھی اپنی زبان کو جیب میں رکھا کریں

آدمی پر آدمی کی قبر تھی
بلبلے پر بلبلہ پانی میں تھا

سب قافیے دماغ سے نکال کر
مطلع میں نظم کوئی اچھوتا خیال کر

فرصت ہو تو اپنی باتیں منوانے کی کوشش میں
لمبی بحثیں چھڑ جاتی ہیں معمولی سے نکتوں پر

ان اشعار میں احساس و تدبر کے ساتھ ایک ہلکی سی طنزیہ لَے بھی اُبھرتی نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مروجہ شعر گوئی کے عیوب و محاسن سے آگاہ ہے لیکن شعر کہنے کو "بائیں ہاتھ کا کھیل" سمجھتا ہے۔ غزل کی لفظیات کو توڑ پھوڑ کے بعد کمرشیل عصر کی دانش وری کے محاورے کے قریب لانے کی یہ شعوری کوشش جو "لاشعور" میں یہاں وہاں نظر آتی ہے اور اس بروا کے چکنے چکنے

تکمیل

بات کا احساس ہوتا ہے اور اس لئے امید بندھتی ہے کہ آگے چل کر یہ کوشش ایک "معتبر" اسلوب بن سکے گی۔ وہ میرے سامنے رکھے ہوئے اشعار میں ـــ نمود پاتی دکھائی نہیں دیتی۔ صرف اتنا ہوا کہ جو کوشش لگ رہی تھی کہ نظر آتی تھی اب مستقل نظر آنے لگی ہے۔ اگر میرا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر میری یہ پیش گوئی بھی صحیح نکلے گی۔ بہت جلد نظام کو بھی یہ احساس ہو جائے گا کہ شعریت لفظوں کے نامانوس اور غیر روایتی ہونے سے نہیں پیدا ہوتی۔ نہ ایسی شعوری کوشش سے پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں "رس" کو ضائع کیا جائے۔ ان میں یقیناً ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ "اس بول چال کی معیاری ادبی زبان" کی روانی میں کچھ روایتی شیرینی بھی گھول سکتے ہیں۔ اور غزل کے رواں اسلوب کو سہلِ ممتنع کے قریب لا سکتے ہیں (کسی شاعر کے لیے جو بڑی دشوار منزل ہے) وہ اپنی نظم کو جدیدیت کی اصطلاحوں "کے استعمال سے نہیں بلکہ ان کے معنوں کے استعمال سے سنوار کر تہہ زور اور بلیغ شاعری کر چکے ہیں، کیوں کہ جس شاعر کو یہ احساس ہو کہ

نظامؔ شاعری بچوں کا کھیل ہو ہی گئی
گنوا کے گیند نئے قافیے تلاش کیے

وہ صرف نئے قافیے نہیں، نئے مضامین بھی تلاش کر سکتا ہے اور "کلام" کو شعر بنا سکتا ہے چاہے اس میں روایتی تغزل شامل کرے یا کلاسیکی غنائیت۔ ●●

غزل کی سرحدیں اور نظام

قیصر الجعفری

اردو شاعری کے پاس غزل کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہے کہ کسی نئے شاعر کو اپنی تخلیقات کے بل پر سب سے الگ تھلگ اپنا مقام بنانا اور اپنی پہچان کرانا آسان نہیں ہوتا۔ شعراء کے ایک طویل سلسلے میں چند ہی شخصیتیں ایسی ابھرپاتی ہیں جو اپنے دور کی شعری اور شعوری طور سے عکاسی کر کے دلوں اور ذہنوں میں اتھل پتھل پیدا کرتی ہیں اور زبان وادب کے معیار، اسلوب اور انفرادیت کو آگے بڑھاتی ہیں۔ زیادہ تر شعراء اپنے ابتدائی دور میں خیالوں کے جگنو پکڑنے کے لئے کمرے کی سیاہ راتوں میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور ہر ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو اپنی گرفت میں لے کر شاعری کا تماشہ شروع کر دیتے ہیں۔ ان اخلاقی قلابازیوں میں بیشتر شعراء کی تمام عمر ہی رائیگاں ہوتی دیکھی گئی ہے۔ مگر نظام الدین نظام کے یہاں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیالوں کے جگنو پکڑنے کے لیے اس نے ذہن کے بڑے گھنے جنگلوں اور صحراؤں کا طویل سفر طے کیا ہے اُس نے جب شاعری شروع کی اس وقت ترقی پسند تحریک اپنی آخری منزل کے قریب آ چکی تھی جدید یا شاعر طے شدہ فکری خدوخال سے الگ نئے الفاظ اور نئی علامات کے بے آہنگ اور ناآشنا سہارے لے کر غزل اور نظم کے پیکر تراشنے میں مصروف تھے۔ اس بھیڑ میں جن شعراء نے ترسیل اور ابلاغ کی شعری ضرورت کو محسوس کیا اور صدیوں کی تراشیدہ روایت کے حسن کو نظرانداز نہیں کیا ان میں "لاشعور" کا شاعر نظام بھی ہے۔

مجھے نظام کے شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے جب زندگی کے کھردرے پن کو محسوس کیا ہوگا تو اس نے اپنے دل کا سارا زہر اپنے دوستوں میں ملنے والوں میں، گھر میں، بازاروں میں، بے ساختہ، بلا حجاب، دوٹوک، نوک زبان سے اچھالا ہوگا اور اس کا شدید ردِ عمل سننے والوں پر محسوس کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو بار بار دہرائی نہیں جا سکتی، یاد بھی نہیں رکھی جا سکتی، صرف اپنی ذات سے منسوب بھی نہیں کی جا سکتی اور روز روز بدلا سے محفوظ نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن شعر میں اگر یہی باتیں سموئی جائیں تو ان کو پر دبال لگ جاتے ہیں۔ اس فیصلے تک پہونچنے کے لیے میرے پاس بہت سے اسباب ہیں۔ ان میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس قدر براہِ راست مخاطبت اُسی وقت ہو سکتی ہے جب کچھ کہنے کے لیے پاس ہو۔ قافیوں کی سیڑھی پر پاؤں رکھ کر چھلانگ لگانے والا شاعر یہ شعر نہیں کہہ سکتا۔

میری تعمیر میں اس کا بھی بڑا ہاتھ رہا
شخصیت پر جو میری وار ہوا تھا اُس دن

شاید شخصیت پر وار کا یہی حادثہ نظام کی شاعری کی بنیاد بن گیا۔ وہ ذہن کا کھردرا پن، احساس کی پراگندگی، لاشعور کا دھواں، فکر کا نوکیلا پن، لب و لہجہ کا زہر اور جذبے کی تیزابیت سب کو شعر میں سمو کر اپنے قریب ترین ساتھیوں پر پھینکنے لگا۔ ساتھی جو اس کے مزاج سے آشنا تھے، اس کے تیور پہچانتے تھے اور اس کی انا کے گھاؤ سے واقف تھے۔ نظام کے شعر رفتہ رفتہ اس کے اندر کے آدمی کا سچا روپ ہوتے گئے اور اس طرح وہ پھیلتا گیا دائرہ بہ دائرہ، محفل بہ محفل ـــ

"دِل" اردو غزل کا دل ہے مگر نظام کی شاعری میں اس کا وجود نظر نہیں آتا۔ اس کا درد ریڑھ کی ہڈی کا درد ہے جو ذہن کو روندتا ہے۔ اس لئے سے میں نظام کو "ذہن کا شاعر" کہوں گا۔ اس کی غزلوں میں دل کا مقام نہ ہونے کی وجہ سے رومانوی فضا دور دور تک نظر نہ آئے گی مگر سورج جو ذہن سے نکل کر شعر کے پس منظر میں پھیلتی چلی گئی ہے اس میں بھیگتے ہوئے جگنوؤں کی موہوم غنودگی

کا سا عالم ہے۔ قاری شاعر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کی خارجیت کی تہہ میں ابھری ہوئی داخلیت ہر دیوار کو توڑ دیتی ہے۔ شاعر اور قاری کے درمیان کا فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ قاری خود پتھر فراہم کرتا ہے اور کہتا ہے "شاعر لو مجھے مارو تمہارے پتھروں میں سچائی ہے، محبت ہے، انانیت ہے، ساری دنیا پر طنز ہے، خود پرستی ہے اور خدا سے ٹکرا جانے کا حوصلہ ہے"

صرف تقدیر سے پانے کی تمنا بے سود
اور تدبیر کے لاشے پر خدا بھی بے کار

نظام الدین نظام نے اپنی برہنہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، لگتا ہے اسے اپنے سارے جسم سے برتا ہے۔ اس کے شعر میں ہر منظر ایک تجزیاتی پس منظر لے کر آتا ہے اور نظام کا جھنجلایا ہوا شعور ہر سچائی کو بغیر کسی سہارے کے پیش کرتا ہے۔ بظاہر یہ عمل حُسنِ شعر کے منافی ہوتا ہے مگر لہجہ کی معصومیت اور اندازِ نظر کی بے باکی شعر میں حسن بھر دیتی ہے۔

مجھ کو کاغذ چننے والی اچھی لگتی ہے
میلے کپڑوں میں بھی سالی اچھی لگتی ہے

"سالی نئی لغت کا لفظ ہے۔ یہاں یہ جس مفہوم کے لئے کہا گیا ہے۔ کسی دوسرے لفظ سے ادا ہونا محال ہے۔ اس لفظ کے پیچھے محنت کش طبقے میں بھی سب سے نچلے طبقے کی ایک مجبور بدحال اور بے نیاز عورت کی دل دوز داستاں پوشیدہ ہے حق یہ ہے کہ اسی ایک بے باک لفظ کی دین یہ شعر ہے۔ نظام اس لفظ کو استعمال کر کے عریاں نہیں ہوا، کاغذ چننے والی بھی برہنہ نہیں ہوئی بلکہ وہ معاشرہ ننگا ہو گیا جس میں ہم بمبئی کے عوام سانس لے رہے ہیں۔

نظام اپنے شعروں میں اِتنا کیسے بکھر گیا، مقام حیرت ہے وہ اپنی زندگی میں جس قدر بے باک، شریر، تیکھا اور پیارا نظر آتا ہے اشعار میں بھی ویسا ہی ہے اور ایسا شاید اس لئے ہے کہ وہ خیال کی گرفت کے لئے آسماں پر نہیں اڑتا

بلکہ قدم دو قدم کے فاصلے پر جو حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ انھیں سے ٹکراتا ہے' ایک محدود دائرے میں وہ جال پھینکتا ہے جس میں اس کی ذات' اس کا گھر' اس کے دوست دو چار سال پرانا ماضی' دو چار سال طویل مستقبل اور اس دائرے پر پھیلی ہوئی مہربان راتوں کی لذت آگیں تنہائیاں اس کی شعری حدیں ہیں۔ یہ سرحدیں پھیلی ہوئی نہ ہونے کے باوجود اپنی گہرائی میں بے کراں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی سوچ نے دنیا کو شکار کر لیا ہے۔

خواہش کا پہلا وار تھا تخلیق شعر کی
وہ رات میری سوچ کا پہلا شکار تھی

نظام الدین نظام کے یہاں جو رنگ سب سے زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے وہ طنز ہے جدید شاعروں میں چند دوسروں نے بھی اس رنگ میں طبع آزمائی کی مگر بات صرف زرد غزل اور کالی غزل تک محدود ہو کر رہ گئی طنز موضوعات میں نہیں لہجہ میں ہوتا ہے اور میری بشارت ہے کہ نظام کو یہ لہجہ راس آئے گا۔ آج بھی اسکے اشعار طنز کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان کو حاشیوں اور دواوین کی ضرورت نہیں

عجب سیاسی تلذذ ہے ورغلانے میں کہ نوجوان بدن فاحشہ کی زد میں ہے

میری پرواز کا منظر ابھی تیر دل چھلنی ہے لہو میں تر بتر ہے داستاں نقل مکانی کی

اُٹھے وہ قدرت ہے گردشوں پر عذاب محشر مثال دے گا
بس ایک مٹھی ہوا کسی دن خلا کی جانب اچھال دے گا

نئی سڑک کے موڑ پر نشان بن کے رہ گیا کھنڈر میں جان کیا پڑی' مکان بن کے رہ گیا
مار ڈالا خوف کو لیکن خطر رہنے دیا سانپ کے ٹکڑے کیے اور اس کا گھر رہنے دیا

ان اشعار میں بڑی تیزابیت ہے اور بہت ممکن ہے کل کے نقاد اسے نظامیت کا نام دیں —— جدید ترین نسل کے اور بھی بہت سے لوگ اچھے شعر کہہ رہے ہیں خاصے سرگرم سفر ہیں سورج کے اجالے پس غبار بھی ہیں اور سامنے بھی۔ مگر نظام الدین نظام سب کے ساتھ رہ کر سب سے الگ ہیں۔

تکمیل

برہنہ اسلوب کی شاعری اور نظام الدین نظام

انور خان

غزل پر آج دو طرح سے سوچا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ آج تک غزل نئی حسیت کا برابر ساتھ دیتی آئی ہے۔ اگر آج کا شاعر اس میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ دوسرے سوچتے ہیں کہ اگر غزل کو بحیثیت ایک صنف کے باقی رہنا ہے تو اس میں بڑی ریڈیکل قسم کی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اب تک غزل کا جو غنائی' کلاسیکی لہجہ رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ طنزیہ' تیزابی' راست دوٹوک لہجے کو بھی جگہ دینی ہوگی تاکہ آج کے عہد کا خلفشار' بکھراؤ' بے یقینی' اقدار کی پامالی اس میں موثر ڈھنگ سے آ سکے۔ ان خیالات سے پہلا گروہ متفق نہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ پھر غزل 'غزل کب رہے گی۔

بہرحال نیا شاعر خواہ چاہے خواہ نہ چاہے اگر وہ کسی بڑے شہر میں رہ رہا ہے تو شہر کی یا جوجی زندگی کے اثرات اس کے لہجے پر مسلسل پڑتے رہتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو نظم کا فارم آج کا موزوں ترین فارم ہے لیکن دو مصرعوں میں چمتکار دکھانے کی خواہش ہمارے شاعروں کو اس طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی۔ بیشتر شاعر دوغلے پن کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک طرف کلاسیکی لب و لہجہ دامن کش ہوتا ہے تو دوسری طرف اینٹی غزل کے عناصر اپنی طرف کھینچتے ہیں اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر غزلوں کا ایسا کوئی اسلوب نہیں بن پاتا کہ یہ احساس ہو کہ اسلوب و موضوع ایک جان ہو گئے ہیں۔

اپنے ایک مضمون "غزل کے نئے جہات" میں سید محمد عقیل لکھتے ہیں:۔ کلاسکیت کی شرافت (nobleness) اور ارفع جذبات' اشرافیہ Aristocracy

کے تجربے، زبان کی بلندی اور ترفع سب دور کی آواز سنتے جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان انتہا روایتی اور میکانکی نہیں رہی کہ ایک خاص جذبے کے اظہار کے لیے وہی ڈھلی ڈھلائی زبان استعمال ہو جو غزل کی روایت میں چلا آرہی ہے۔ بیٹھکوں اور دیوان خانوں کے تجربے اب سڑک، چائے خانوں اور بسوں کے تجربوں سے بدل رہے ہیں۔ صفائی اور سادگی نظر آتی ہے تو انھیں تجربوں سے جو شاعر اپنی روزمرّہ زندگی میں کرتا رہا ہے۔ وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے دیوان خانے اور جعفر علی خاں اثر کے ترشے ہوئے محاورات کی خبر نہیں رکھتا۔ یہ شکایت نہیں ہے بلکہ بدلتے ہوئے حالات کا اندازا (غزل کہنے جہات میں)

آج کا شاعر شیفتہ کے دیوان خانے یا جعفر علی خاں

اثر کے ترشے ہوئے محاورات کی خبر رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو آج کا روزمرہ بدل چکا ہے۔ اس بات کو سمجھے بغیر نئی غزل سے لطف اندوز ہونا ممکن نہیں۔ اپنے اسی مضمون میں خود سید محمد عقیل نے لکھا ہے کہ اردو غزل کا پورا میک اپ کم و بیش جاگیردارانہ ہے۔ آج کے صنعتی تمدن نے قدروں میں جو بحران پیدا کیا ہے غزل کے کلاسیکل ڈکشن کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا اظہار آسان نہیں کلاسیکی غزل جذبات کی تہذیب کا تقاضہ کرتی ہے۔ کلاسیکل لہجہ مدنظر رکھا جائے تو آج کی زندگی کا انتشار، خوف، بھیانک پن عصری حسیت اور کیفیت کے ساتھ کم ہی گرفت میں آتے ہیں۔ غزل کے روایتی ڈکشن میں یہ باتیں محض ایک نفیس سا بیان بن کر رہ جاتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بمبئی کے شاعر شروع سے اس بات کو محسوس کرتے رہے ہیں۔ اختر الایمان جاں نثار اختر، باقر مہدی، ندا فاضلی، عزیز قیسی سب نے عصری زندگی کے تجربوں کو مؤثر طریقوں سے اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ نظم میں تو کسی حد تک کامیابی ہوئی غزل میں یہ اب تک ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

بمبئی کے نئے شاعروں کا تعلق دیہات یا قصبے سے نہیں رہا۔ اُن کے لیے انتخاب کی آزادی اور بھی کم ہے۔ بمبئی کی زندگی سے اُسے چھوٹے شہروں،

دیہاتوں یا قصبے سے آئے لوگوں کی طرح وحشت نہیں ہوتی۔ اُس کا احساس دوسروں سے مختلف ہے۔ کلاسیکی لہجہ اُس کے لئے زیادہ سودمند نہیں۔ اُسے اپنے اسلوب کے ساتھ مسلسل تجربے کرنے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی بات ارتضیٰ نشاط سے شروع کریں جو نئے شاعروں میں سب سے سینیئر شاعر ہیں۔ ارتضیٰ نشاط نے ظفر اقبال سے استفادہ کرکے اینٹی غزل کے عناصر اپنے اشعار میں داخل کیے۔ ارتضیٰ نشاط برسوں کلاسیکی انداز میں غزلیں کہتے رہے ہیں۔ اُن کے اپنے مزاج میں نرمی اور انداز میں گھلاوٹ ہے اس لیے اینٹی غزل کے عناصر کے باوجود اُن کے اشعار میں ہلکاپن یا چھچھوراپن نہیں آتا۔ بلکہ ایک طرح سے بمبئی کی زندگی کے تجربات اس رچاؤ کے ساتھ آتے ہیں کہ غزل، غزل ہی رہتی ہے اینٹی غزل نہیں معلوم ہوتی۔ یہ اشعار دیکھئے۔

"سب سے دل چسپ یہی غم ہے مری بستی کا — موت پسماندہ علاقے میں دوا لگتی ہے
رچا یا سوانگ پاگل پن کا لیکن — گھڑی باندھے ہوئے ہیں ہاتھ پر ہوں"

اس برہنہ لہجے میں کتنی شدت ہے، کہیں ہائیکو سا اثر، کہیں اینٹی غزل کا اور کہیں طنز کی تیز دھار۔ نظام الدین نظام اس مزاج کے نشاط کے بعد دوسرے شاعر ہیں۔ نشاط کے مزاج میں نرمی ہے۔ ٹھہراؤ ہے۔ نظام الدین نظام کے یہاں سرکشی ہے۔ بے پناہ قوت جو بکھرنے کے لیے بے قرار ہے۔ تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ ابھی اُن کے خیالات اور انداز میں وہ تہہ داری اور پیچیدگی نہیں آئی جس کی ہم غزل کے شاعر سے توقع کرتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں ۔

میری تعمیر میں اس کا بھی بڑا ہاتھ رہا — شخصیت پر جو مری وار ہوا تھا اُس دن
تاب آنکھوں میں نہیں تو آئیے ایسا کریں — دھوپ کی عینک لگا کر آسماں دیکھا کریں
ایک مینڈک تجربے کی میز پر — مشتعل کتنا ہی ہو بے کار ہے

نظام کے اشعار میں "اشرافیہ کا رکھ رکھاؤ" نہیں، کلاسیکیت کی شرافت بھی نہیں۔ شعر دراصل یہاں شاعر کے لئے محض لفظوں کا کھیل نہیں وہ زندگی کے ان دیکھے تجربوں کو براہِ راست قاری تک منتقل کرنے کی کوشش میں ہے جو صنعتی تمدن

اور ٹیکنالوجی کے عہد کی دین ہے۔ سچ پوچھئے تو نظام اشرافیہ کا آدمی ہے بھی نہیں۔ نشاط کی طرح وہ لیبر کلاس کا آدمی ہے۔ اس کی اخلاقیات بھی اسی کلاس کی ہے۔ وہ بار بار اشرافیہ کی منافقت اور بزدلی پر وار کرتا ہے۔ اُسکی مصلحت اندیشی کا ذکر کرتا ہے۔ بلکہ بمبئی میں جب کسی کو شریف آدمی کہا جاتا ہے تو اس کی انہی صفات کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

شب کے سناٹے میں اس کو قتل کردیں دوستو　　اور پھر ماتم اُسی انسان کا برپا کریں
آپ کو بھی لوگ گرا دیں گے دانشور نظامؔ　　آپ بھی اپنی زباں کو جیب میں رکھا کریں
ذہنوں میں جھانکنے کی ہے فرصت یہاں کسے　　خوش پوشیوں سے اپنی نفاست جتایئے

شاید آپ سوچیں کہ غزل میں کلاس کا کیا ذکر۔ لیکن شہری زندگی کے تجربے آج کے عہد کے تقاضے ہمیں اس طرح سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں خصوصاً جب اشعار میں لطیف اور نازک جذبات سے ہٹ کر اپنے عہد کی زندگی اور اخلاقیات کا بھی ذکر ہو ؎

جیب میں تنخواہ تھی آنکھوں میں حیرانی نظامؔ　　ایک نئے انداز کا دکھلا گیا کرتب مجھے
تاریخوں کا خوف ہے دل میں کلینڈر پر آنکھیں ہیں　　جانے کیا کیا روگ خریدا نادانوں نے قسطوں پر

زندگی کا تعارف بہت مختصر ___ خواہشیں الجھنیں، تلخیاں اور میں

نومبر ۱۹۸۷ء کے کتاب نما میں سردار جعفری نے ایک سوال کے جواب میں یہ بات کہی ہے جس سے آج کے غزل گو شاعر کی مشکلات کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

" میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا اردو غزل آشنا مزاج نثر میں بھی جس میں آرائشی حصہ بہت زیادہ ہے اور اس آرائشی حصہ کی وجہ سے ہم بعض اوقات افکار کی بلندی اور وسعت تک نہیں پہنچ پاتے۔ اور انہیں لفظوں سے ہم وسیع تر معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم انگریزی سے مثال لیں تو آج ۱۹۹۰ء میں انگلستان کا کوئی شاعر (روایتی انداز سے کہہ رہا ہو یا غیر روایتی انداز سے) شیکسپیئر کی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ علاوہ یہ کہ ملٹن کی زبان میں بھی نہیں کرتا علاوہ یہ کہ کیٹس اور شیلی کی زبان میں بھی نہیں کرتا لیکن ہم آج بھی حافظ شیرازی کی زبان میں شاعری

کرتے ہیں۔ اور ہماری تمام غزلوں میں الفاظ کا ایک سیٹ ہے کوئی پانچ سو الفاظ کا۔ انھیں سے ہم بڑے مفاہیم پیدا کرتے ہیں اس لئے کہ وہ تو ایک Style ایمجری ہو گئی ہے۔ اور دوسری چیز اس کے ساتھ کیا ہوتی ہے کہ کیا استعارہ بن گیا ہے۔ اس استعارہ بننے کی وجہ سے "اس میخانے" کا لفظ جو ہے وہ مختلف مقامات پر مختلف معانی اختیار کر لیتا مثال کے طور پر میں نے ابھی امام خمینی کی غزلیں پڑھی ہیں فارسی میں۔ جن میں اس طرح کے اشعار کہ میں مسجد و مدرسہ سے بےزار ہو کر مے خانے میں آ گیا ہوں تمہاری آنکھوں کا دیوانہ ہو کر میں عاشق ہو گیا ہوں وغیرہ۔ اس پر عنوان یہ ہے کہ یہ امام خمینی کی روحانی شاعری ہے۔ یہی غزل جب کوئی ترقی پسند کہتا ہے کہ میں مسجد و مدرسے سے بیزار ہو کر مے خانے میں آ گیا ہوں تو اسے انقلابی معانی دے دیئے جاتے ہیں۔ اور جب کوئی لکھنؤ کا روایتی شاعر یہی بات کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ فرسودہ شاعری ہے"۔

آج کا غزل گو شاعر اس صورت حال کو بدلنے کا خواہش مند ہے۔ قاری اور ناقد بھی یہی چاہتے ہیں لیکن جب غزل میں وہ روایتی، کلاسیکی دروبست یا اہتمام نہیں ملتا، وہ غذا نہیں ملتی جس کا وہ عادی ہو چکا ہے تو وہ جھنجلا کر اسے رد کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک نئے شاعروں کی یہ کوششیں قابل تعریف ہیں۔ ہر چند کہ ابھی وہ اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو پائے۔ لہجہ یکساں ہو جاتا ہے، اشعار سپاٹ یا بے رس، گہرائی نہیں ہوتی، مصنوعات کا تنوع نہیں ہوتا لیکن جب کوئی اچھا شعر سرزد ہوتا ہے تو بھرپور ہوتا ہے۔ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ، آج کی حسیت سے قریب۔

نظام کی شاعری لمحۂ موجود کی شاعری ہے۔ اپنے ماضی، اپنے بچپن کو شاذ و نادر ہی یاد کرتے ہیں۔ اندیشۂ فردا بھی ان کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔

میں کڑی دھوپ ہوں اور برف ہے لمس نظام اب ٹھہرنا ہے مجھے اس کو روا ں ہونا ہے

اے مفلسی اے مرے روز و شب کی محرومی وہ حوصلہ دے کہ سوند کو علَم لکھوں

مرے لہو کو جو ستا ہے ان چنا لوں پہ جو ~~کہ سنگلاخ زمینوں کو میں ابھی تم لکھوں~~

تکمیل

بھیونڈی

مری سانسوں میں بس کر دل کو چھلنی کر دیا جس نے
مرے سینے میں بھر دی ہے وہ زہریلی ہوا تو نے

رہ گزر ڈوبی ہوئی ہے ممتا کی چھاؤں میں
بے گھری میں آسماں بھی ماں کا آنچل ہو گیا

نظامؔ غزل کے اچھے شاعر ہیں لیکن آج کے دور میں صرف اچھا شاعر ہونا کافی نہیں اس سے کچھ زیادہ ہی ہونا چاہیئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نظام کا اسلوب زیادہ پیچیدہ اور متنوع اور اظہار مزید پختہ ہو گا۔ ان کی شاعری زیادہ معنی خیز اور اہم ہو گی اس سے غزل کے اس نئے اسلوب کو جس کے لئے شعرا برابر کوشش کر رہے ہیں تقویت ملے گی۔ اس طرح نظامؔ کی شاعری کو استحکام حاصل ہو گا اور نئے شعراء کا کام سہل ہو گا۔

●●

لب و لہجہ

جاوید ناصر

آج کل شاعری لفظیات کی سطح پر صاف اور واضح عدم انقلابیت کی شکار ہے، اس لیے کہ کم و بیش ہر منہ بولا شاعری کے اختیاری مترادفات کی جگالی کا شوقین ہے۔ رسائل کے صفحات پر یا تو علامتوں کے ریوڑ ہیں یا امیجز کے گلے، استعاروں کے اصطبل ہیں یا اسطور کے چڑیا گھر۔ گویا شاعری کوئی مجرّد شئے نہیں ہے اگر ہے تو ویران اور بنجر ہے، یہ لوازمات اور تلازمات تو زندہ تخلیق سے پھوٹتے ہیں، تخلیق کو ان سے کیا سروکار ـــ

غیر محفوظیت، تنہائی، ذات کا کرب، تشویش و تردّد اور دیگر بقراطیں تخلیق کے ہاتھ پیر تو مضبوط کر سکتی ہیں لیکن دورانِ خون تو تخلیق کی اپنی سرشت اور دھڑکن ہی سے وابستہ رہے گا۔ الفاظ لہو ہیں اور ان کی گردش شاعری ہے۔ اسی لیے ملارمے نے کہا ہے کہ شاعری خیالات سے نہیں الفاظ سے کی جاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ایلیٹ نے زبان کے تحفظ کو شاعری کا سماجی فنکشن قرار دیا ہے زبان شاعری کا واسطہ ہے، اور یہ واسطہ نہایت منہ زور فرماں روا غیور اور بالکانہ فطرت کا مالک ہے جو شاعر سے مکمل سپردگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہ شاعر کا تخلیقی تخیل ہی ہے جو اس سپردگی کو، اس جذب کو فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا راز دار اور لاشعور کی اضطراری جہالتوں کا شناسا بناتا ہے اور شاعر کو بغاوت کے حسّی سرّی اور ازلی وحشتوں کے مطالبہ کی تکمیل کی سکت دیتا ہے۔ ورنہ وہ لفظ جو میر کی دسترس میں تھا، غالب کے لیے گونگا بن جاتا۔ اقبال کے لئے آزاد اور فراق

فیض کے لیے بے گانہ۔ اور اسی لفظ کو تخلیقی تخیل آج کے شاعر کا احساس بنا دیتا ہے، حالانکہ اس لفظ کے ساتھ دوسروں کے احساسات کا انبار ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور Versification کا فرق منہدم ہو جاتا ہے اور یہ انہدام تخلیقی تخیل ہی کے بس کا روگ ہے۔ ویسے ہر شاعر بھی Versifier ہوتا ہے لیکن Versifier کا شاعر ہونا محال ہے۔ اسی Versification نے جدید شاعری کو بھی ایک جامد روایت اور ایک ساکت تکرار میں تبدیل کر دیا ہے۔ استعارے امیجز، علامتیں اور پیکر کثرتِ استعمال سے بقول ایلیٹ احساس کے فارمولے بن گئے ہیں۔ Versification روایت کے غیر تخلیقی تسلسل کا نام ہے جب سرکشی نہ ہوں تو نہ سرشت جاگتی ہے نہ بنیادوں میں فرق پیدا ہوتا نہ سیاق وسباق میں تبدیلی آتی ہے اور نہ ہی تجربے و مشاہدے محسوسات سے عبارت ہوتے ہیں۔

محض زبان کی تہذیبی مشاقی کا اور مجلس کے حاکمانہ آداب کا پتہ چلتا ہے شاعری روایت کے بلیغ میدانوں کی آوارہ ہوا ہے جو اکتساب بھی کرتی ہے اور انحراف بھی اور یہی اکتساب یہی انحراف لاشعور کے کٹے پھٹے ساحل پر باخبری کی دولت کو تخلیقی تخیل کے حوالے کر دیتا ہے۔ تخلیقی تخیل اپنی ناخدائی میں اسی باخبری کو جو سماجی شعور کا شعری محاکمہ ہے انجان پانیوں کے سفر پر لے جاتا ہے اور یہ مسافت دولتِ بیدار ہے جو نظام الدین نظام کے رگ و ریشے کا آئینہ ہے۔

نظام نے ۱۹۷۰ء کے بعد شاعری شروع کی اور آج اس کے نام آشناؤں میں گلِ نغمہ بھی ہے اور پردۂ ساز بھی۔ اس میں Versification کی بے پناہ صلاحیت ہے لیکن شاعری کی آب کہیں بھی ماند نہیں پڑتی اور اس شرر کی حفاظت کی ذمہ دار نظام کی جذباتی معصومیت ہے۔ اس جذباتی معصومیت نے جہاں اس کو زود رنج اور مخلص بنایا ہے وہاں اس کی طبیعت میں ایک ٹیڑھا ایک کجی اور انا میں ایک خم بھی پیدا کیا ہے۔ شائد اسی لیے وہ کسی انتشار کا شکار نہیں نہ اس کے حواس تخیل میں اور نہ ہی دماغ میں کوئی خناس آباد ہے۔ حیرت انگیز جولانیاں ہیں۔ کبھی کبھی دیوانگی کی چمک میں

تکمیل

بھی تھی

اس کی آنکھوں میں آجاتی ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو شاید نظام شاعری کا محض ایک مضبوط مستقیم دور میں اور مشاق خلیفہ بن جاتا۔ پتہ نہیں نظام کی اب تک کی زندگی کس حدتک عذاب آشنا رہی ہے لیکن اس کے لفظوں میں تیز دھواں ہے لہجہ میں جلن ہے طنز کے نغمہ نشتر ہیں۔ صدمہ ہونے کی تیزاب پسند تلخ و تند فضا ہے

نظام کی غزل میں دیدہ و دانستہ کی تخلیقی دھمک ہے۔ حشر ساماں بمبئی کے ریزہ کار علاقہ میں رہنے کے باوجود ہر منظر صاف ہے ہر مضمون واضح ہے ہر احساس نمایاں اور لہو رنگ ہے۔ نہ کہیں پیچیدگی نہ ابہام۔ مڈلٹن مرے کو ہمیشہ یہ دکھ رہا ہے کہ جدید فنکار ابہام اور Originality کو ہم معنی سمجھتا ہے نظام کے آس پاس ایسے کئی لکھنے والے ہیں جو قابل فہم موضوع کو اپنے ڈکشن سے ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔ شاعر نا قابل فہم موضوع یا تاثر یا سنسنی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تخلیق تاثر، کیفیت یا فضا کی ترسیل کرتی ہے نئے مصوری کی تحریکوں (دادا ازم، کیوب ازم، سرئیل ازم) نے دنیا کی شاعری کو متاثر کیا ہے نظام کے کلام میں شریفانہ سفا کی شاید اسی لیے پیدا ہوئی ہے کہ اس نے درپیش عملی زندگی کی ابتلا ہی سے اپنا سابقہ رکھا ہے۔ احساسات کی صفائی اور اظہار کا منہ زور کھرا پن اس کی خوش ضمیری کا اعلان ہے۔ نظام کے وجود کے قوانین کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا اعتماد لب ریز ہے اور کبھی کبھی چھلک بھی جاتا ہے ممکن ہے یہ غیر ضروری اعتماد عملی زندگی کے لیے سود مند ثابت نہ ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعری کل اسے احساس برتری میں تبدیل کر دے اور نظام کے لہجہ کو اسلوب کا اذن بے چینی کو قرار کا مماثل بنا دے۔

اسلوب فرائڈ کے مطابق فن کار کی سوانح عمری ہے اور ابھی نظام کو زندگی کے کڑے کوس کاٹنے ہیں۔ اس کے حق میں یہ بہتر ہے کہ وہ کسی بھی اتمام و اطمینان اور تسلی و طمانیت سے دور رہے کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی جدیدیت ایک رجحان ہی سہی لیکن اس سے لفظ کی بلا خیزی کھلی اور اس کا تکمیل

بھیونڈی

متداول معنوی ساخت کی اہمیت پھر ایک بار واضح ہوئی۔ مروجہ برتاؤ نے وہ راستے بھی منتخب کیے جو ادبی توفیق اور تخلیقی کشف کے عازم سفر ہونے کے منتظر تھے۔ یہاں الفاظ اپنی حرمتوں سے معانقہ کرتے ہیں اور دور دراز کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔ ذات، وجود، انا، شکست و ریخت، برگشتگی کا وہ شور بلند ہوا کہ آج ہم اس پیریڈ کو Expression کا پیریڈ کہہ سکتے ہیں جیسے ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ایک اسلوب کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ سبھی ایک دائرہ کے قیدی بن گئے۔ منتخب الفاظ کی تکرار بزمیہ شاعری کی روایت کی طرح Unwritten آئین بن گئی اور جدیدیت زبان و بیان کی سطح پر غیر معینہ تحریک بن گئی۔ وہی الفاظ، وہی ان کے علامتی مفاہیم اور وہی منزموعہ دآموزدہ تازگی یا اس کا شائبہ۔ تکرار کے اس منظر کو اردو ادب اس سے پہلے بھی مختلف ادوار میں دیکھ چکا ہے۔ بہرحال جدیدیت کے اس دور میں جہاں اور لوگ متاثر ہوتے وہاں نظام کا متاثر ہونا بھی ایک قدرتی بات ہے۔ صرف ایک چیز جو نظام کا دفاع کرتی ہے وہ ہے جذباتی وفور اور یہی جذباتی وفور الفاظ میں لگن پیدا کرتا ہے اور یہی لگن نظام کو جہل پہل کا موقع دیتی ہے اور یہ جہل پہل ردعمل کی نفسیات سے ماخوذ ہے۔ الفاظ موضوعات اور مسائل کا اشتراک ہونے کے باوجود ردعمل مختلف ہے۔ غزلوں سے جب ہم مصافحہ کرتے ہیں تو شناسائی میں ایک تپاک کا احساس ہوتا ہے۔

نکلے بھی کوئی گھر سے نکلنے کا راستہ
دیتا نہیں لباس تو پھر بے حیائی دے

یہ بے سواد مناظر یہ بے نمک چہرے
نظر میں رہتے ہیں اور دل میں گھر نہیں کرتے

میں کڑی دھوپ ہوں اور برف ہے اک شخص نظام
اب ٹھہرنا ہے تجھے اس کو رواں ہونا ہے

جذبے کی قبر پاٹ کے تعمیر کی سڑک
یہ دشمنی نہیں ہے مگر دوستی کی موت

بہت زرخیز مٹی ہے نظام اپنے بن میں بھی
ہوس نے پھول مہکائے لہو نے باغبانی کی

آدمی پر آدمی کی قبر تھی
بلبلے پر بلبلہ پانی میں تھا

ایک چنگاری نے اپنے آپ کو منوا لیا
جل گئی کشتی سمندر ہاتھ مل کر رہ گیا

سوال یہ ہے کہ نظام کی شناخت کیا ہے؟ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ مذکورہ بالا بیانات کے تحت نظام کے کلام میں اس کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن بات پھر بھی وہیں رہ جاتی ہے۔ مکمل شناخت، ذاتی لہجہ، عصری عوامل اور ایک آزاد اکائی کی گونج۔ یہاں میں نظام کے ان اشعار کا ذکر کروں گا جو مختلف ہیں اور سماجی تشکیلات کے لیے کبھی تہذیبی غصّہ کا اظہار کرتے ہیں کبھی طنز ملیح کا اور کبھی محض تمسخر کا یہ وہ راہداری ہے جس پر چلتے ہوئے توازن قائم نہ رہے تو پھکڑپن آجاتا ہے نظام لفظ شناسی کے بل پر آسانی سے نکل جاتے ہیں۔

شہرتوں کے بام سے دنیا کا نظارہ کریں ایڑیاں اپنی اٹھا کر ہم بھی قد اونچا کریں
دانتوں کے کچھ نشان میری پنڈلیوں پہ ہیں سوچا تھا سب گلی کے ہیں جو پریتہ آئیں گے
میں گرا تو خاک سی اڑنے لگی دن میں نظام اور ہوا تے نا اُمیدی صف بصف آنے لگی
تدریس کے پرانے طریقے بدل گئے عالم کو درس گاہ سے لوٹا دیا گیا
اے تازہ وارد یہ بجلی ہے یہاں کی آب و ہوا کا جادو
نئے پرندوں کو زرد موسم میں سبز شاخوں کا جال دے گا

ابھی تک میں نے نظام کے رویّہ کا ذکر نہیں کیا۔ ایسا کوئی رویّہ تو نظام کے پاس نہیں ہے جس کو ہم کسی فلسفہ، کسی تحریک، کسی ازم یا کسی مذہب کے دین سمجھیں لیکن جس معاشرہ سے وہ دوچار ہے اور جو زندگی اُسے درپیش ہے، اس نے نظام کو آپسی تعلقات کی اعصابی دھمک بھی دی ہے۔ لہجہ میں جلن بھی پیدا کی ہے اور لفظوں کو اعتراف کا حوصلہ بھی دیا ہے اور دنیا کی چالاکیوں کو دنیا ہی کے لئے قبول کرنے کی قوت بھی بخشی ہے۔

صحرا میں میرا کام تو ٹھوکر سے چلے گا ۔۔۔ بھیگے ہوئے بادل کی تمنا ہی کسے ہے
برا ہوا کہ میکدہ دکان بن کے رہ گیا ۔۔۔ نظام سارے بادہ کش حساب میں الجھ گئے
بھول جاؤں گا انہیں جس روز میں دریا ہوا ۔۔۔ پیاس کے مارے ہوئے کچھ لوگ مجھ کو یاد ہیں

اچانک برگ و گل کٹ کٹ کے گرتے ہیں درختوں سے
ہوا کی آستینوں میں چھپے خنجر نکلتے ہیں

دہکتی آگ کے آگے کپاس رکھ دی ہے ۔۔۔ نظام خون کے رشتوں پہ غور کرتے ہوئے

نظام کے لب و لہجہ کی یہی کاٹ، یہی طنز اور یہی تیز ابیت ہی اس کی تشکیل کرتی ہے۔ مہذب بغاوت، متمدن کجی اور باادب گستاخی اسکی شناخت ہے۔ تاثرات کے اپنے اس خلاصہ سے ہٹ کر سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظام نے تخالف کی دانستہ کوشش نہیں کی۔ زبان اور قواعد کی شکست و ریخت سے کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہی ان حرکتوں سے نیا پن پیدا ہوتا ہے۔ وہ لفظ شناس ہے، لفظ کی معنوی فضا کا راز دار ہے۔ لفظ کے سفر میں لہو کا شریک ہے۔ جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں کہا تھا کہ بقول ایلیٹ شاعری کا سماجی فنکشن زبان کا تحفظ ہے۔ نظام نے شاعری کے اس سماجی فنکشن کو خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا دوست اپنی زبان سے شرمندہ نہیں۔

●●

نظام الدین نظام ــــ اپنی نظموں کی فضا میں

عبد الاحد ساز

نظام برہنہ اسلوب کا شاعر، تیزابی لب و لہجہ، طنز کی گہری کاٹ، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہیں نظام الدین نظام کی ابتدائی ادھوری شناخت کے وہ رنگین غبارے جو ۱۹۶۰ء کے دہے کے آخری دو تین سالوں سے ۱۹۷۰ء کے دہے کے ابتدائی تین چار برسوں تک ان کے سر پر منڈلاتے رہے، اور ان کے آس پاس ایک خوش فہم آسودگی کے دائرے بکھیرتے رہے۔ ان دائروں میں شاعر کے ساتھ اس کے قریبی پڑھنے اور سننے والے بھی اسیر ہوئے۔ انہی رنگین غباروں کی چمکیلی فضا میں نظام کا پہلا شعری مجموعہ "لاشعور" طلوع ہوا اور اسی گلیمر کا حصہ بن کے رہ بھی گیا۔ اس سے ان کی شناخت کا اک ہیولیٰ بنا تو سہی، لیکن نیم پختہ اور غیر سنجیدہ۔

بعد کو نظام کی یہ پہچان تحلیل ہوگئی، لیکن ان کا نام ان کے قاری کے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دوران وہ اخبارات و رسائل میں بکثرت چھپتے رہے اور اس تسلسل کے ساتھ کہ وہ قاری کی یادداشت میں دور تک اور دیر تک کے لیے نقش ہوگئے۔ اتنی دیر تک کے لیے کہ جب نظام اپنے اس ابتدائی دور کے بعد وقتی طور پر ادب سے نیم کنارہ کش ہوکر، پبلک کی پسند اور غزل گائیکوں کی فرمائش کے تحت لکھی جانے والی غزلوں کے تجارتی نشیب و فراز کی سیر کر کے کیسٹ کی شہرت بھری دنیا کے ہنگاموں سے باہر آئے اور دوبارہ ادبی رسائل کی طرف رجوع ہوئے تو ان کا نام قاری کے حافظے میں ہنوز اتنا ہی معروف اور مانوس تھا۔ اس طرح یہ چند برس ضائع ہوتے ہوئے بھی ضائع نہیں ہوئے، بلکہ شاعر کو خود احتسابی کی توفیق سے بہرہ ور اور کاغذ پر لکھے جانے والے لفظ کی حرمت سے آشنا کر گئے۔

ذکریا منور، چوتھا منزلہ، ۱۴۹ یوسف مہر علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

نظامؔ کی شاعری دراصل اس ہوائی جہاز کی طرح ہے جس نے Take-off سے پہلے رن وے پر غضب کے طویل فراٹے بھرے اور زمین ہی زمین پر اپنے پَر تولے ہوئے محوِ پرواز ہونے کا سا سماں پیش کرتا رہا۔ ٹیک آف تو ادھر چند سال قبل شروع ہوا ہے۔ اب یہ شاعری تخلیقی سطح پر زمین کے محفوظ و مانوس حصار سے نکل کر اڑان کے مرحلوں میں پیش آنے والے کرۂ ہوا کے دباؤ اور تناؤ کے تکنیکی و معنوی کوائف سے نبرد آزما رہا ہے۔ زمین کے محفوظ و مانوس حصار قریبی دوستوں اور مشاعروں کی داد و تحسین تھی۔ کرۂ ہوا کا مرحلہ سنجیدہ و پختہ ادبی شناخت کی تلاش ہے۔

میں نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا احساس اور احتساب خود نظامؔ کے پاس بھی ہے۔ میں نے انھیں بارہا کبھی بڑے انکسار سے اور کبھی انتہائی سفّاکی کے ساتھ اپنی "لاشعور" کی شاعری کو Disown کرتے سنا ہے۔ میں، مگر اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ جس طرح یہ سچ ہے کہ 'لاشعور' کا معتدبہ حصّہ متاثر نہیں کرتا، وہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کتاب میں بعض ایسے بھرپور نمائندہ اشعار اور نظمیں بھی موجود ہیں، جو نہ صرف یہ کہ متوجہ کرتی ہیں، بلکہ جن میں نظامؔ کی موجودہ شاعری کے تخم کو بخوبی پہچانا بھی جا سکتا ہے۔ یہ ان کے شعری کا ایسا حصّہ ہیں، جسے کسی بھی قیمت پر ردّ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اگرچہ ابتدائی اور موجودہ شاعری کا موازنہ مدِّنظر نہیں ہے اور اس مضمون کا احاطہ نظامؔ کی نظمیہ شاعری ہے؛ تاہم ارتباط کے طور پر دو ایک باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

"لاشعور" کے مطالعے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظامؔ کے ہاں نظم کے امکانات غزل کے مقابلے میں قوی تر ہیں۔ اطراف و اکناف کے بکھرے ہوئے مشاہدوں کو مربوط کر کے دیکھنے کا عمل، ادراک میں ایک تسلسل، تجربات کے الجھے ہوئے دھاگوں میں سے اظہار کا ایک ڈورا بخوبی الگ نکال لینے کا طریقہ ترسیل میں ترتیب و تدریج ـــــ یہ وہ ادا مرہیں جو غزل کے ایمائی و جذباتی مزاج کی بہ نسبت نظم کے موضوعی و منطقی کردار سے قریب ہیں۔ باوجود اس کے کہ "لاشعور" میں غزلوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، اگر تناسب کی رو سے دیکھا جائے تو غزلوں میں اچھے شعروں کے تناسب کے مقابلے میں نظموں میں اچھی نظموں کا تناسب بہتر ہے۔ "لاشعور" کی دو نمائندہ

نظموں کے اقتباس دیکھئے ــــ

مگر میں قاتل کا ہم نوا ہوں
مجھے عدالت سے بغض بھی ہے
یہی ہے کوشش
تمام قوت، تمام فہم و شعور اپنا
میں صرف کردوں
اسے بچالوں
کہ میرے اندر بھی ایک قاتل
بہت دنوں سے چھپا ہوا ہے۔ (پانی سے پالا ہے)

یہ ساحل، یہ موجیں، یہ سورج، یہ شام
مجھے آج جیسے نئے لگ رہے ہیں
نئے لگ رہے ہیں تو کچھ بات ہوگی
مگر بات کیا ہے
نہ دل میں خلش ہے، نہ آنکھوں میں منظر، نہ سر میں دھواں
مجھے چھوڑ کر سب کہاں چل دیے
مجھے یاد ہے
آج ــــ اپنے بستر پہ بکھری
کتابوں کے صفحوں سے میں
اپنی آنکھوں کے منظر، خلش دل کی، سر کا دھواں
کھرچنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا
(یہی بزدلی تھی)

تو پھر بس یہی بات ہوگی
وگرنہ یہ ساحل، یہ موجیں، یہ سورج، یہ شام
نئے تو نہیں ہیں
نئے لگ رہے ہیں ــــــ تو پھر بس یہی بات ہوگی (تجزیہ)

نظام نے "لاشعور" کے بعد یعنی گذشتہ دس سالوں میں بھی غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ ان میں یقیناً اک ارتقا بھی ہے۔ لیکن فی الوقت مجھے اس سے بحث نہیں ہے، اس پر الگ سے اک مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ میری توجہ، اور ادھر کی، یعنی گذشتہ چار پانچ برسوں کی شاعری پر مرکوز ہے، جو بیّن طور پر نظم سے عبارت ہے۔ اس دوران نظام نے خاصی نظمیں کہی ہیں، اور ان نظموں میں ان کا شعری رویّہ بڑی خوب صورتی سے پنپتا ہوا اور خود کو واضح کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان نظموں کے موضوعات پہلے ہی کی طرح اپنے اردگرد پھیلی ہوئی زندگی سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ بڑے صنعتی شہر میں زندگی کرتے ہوئے متوسط طبقے کے ایک حسّاس فرد کی داخلی و خارجی کشمکش اس نظمیہ شاعری کا مرکز ہے۔ معاشی عدم مساوات، طبقاتی الجھنوں کے بطن سے پیدا ہونے والی ناآسودگیاں اور زہریلی جھنجھلاہٹیں، مشینی زندگی کی بے روح جدّوجہد، سماجی تحفّظات و تعصّبات کے ضمن میں پنپنے والی نفسیاتی گتھیاں، تعلقات کے دہرے کردار، ان تمام کے بیچ گھر کے رشتوں اور محبّتوں کا تزاحم، کہیں معاشرے سے متّصل اور کہیں غیر متّصل ہوتے ہوئے انسان کے خدا سے داخلی و خارجی روابط ــــــ قبولیت اور بدظنی ــــــ موضوعات وہی ہیں، لیکن اِدھر اپروچ میں کافی فرق آگیا ہے۔ احساس کی شدّت میں حالاں کہ اضافہ ہوا ہے، مگر ساتھ ہی اظہار میں ایک استحکام اور توازن آگیا ہے۔ فاش طنز اور ردّ عمل کی جگہ فکری تحمّل نے لے لی ہے۔ زندگی کو دیکھنے کے انداز میں ایک Maturity سی پیدا ہوگئی ہے۔ تضادات کے خلاف تیار ہونے والے غم و غصّے کے محلول میں تضادات کی ہم آہنگی کو قبول کرنے کے سلیقے کی آمیزش ہونے لگی ہے۔

لہجے کے "تیزاب" کے ساتھ فکر کی "اساس" کی باہمی کیمیا کاری سے جو عمل تعدیل (Neutralisation) ہوا ہے اس نے نظام کی شاعری کو تخلیقی نمک بخشا ہے۔ اس کیمیاوی عمل

پروینس کو مختلف منظوم مرکبات میں ملاحظہ کیجیے۔

تعلقات مسائل کو جنم دیتے ہیں
یہ کوئی قول نہیں ہے، محاورہ بھی نہیں
نہ جانے کیسے تعلق ہیں جن کے نطفے سے
یہ سر خمیدہ مسائل فراز ہوتے ہیں
کہ میرے سارے تعلق بہت مقدس ہیں
بہت عزیز ہیں مجھ کو
یہ کوئی قول نہیں ہے، محاورہ بھی نہیں
مگر حقیقت ہے
مرا مزاج مرے حق میں کچھ غنیمت ہے (نظم: میرا مزاج)

دماغ جنگ میں جیتے تو میرا جینا کیا
بھنور میں بیم کے امید کا سفینہ کیا
ہو سرفراز اگر دل تو پھر سپاہِ امید
دفورِ بیم کی لہروں میں ڈوب جائے گی
ہر ایک لہر نئی قبر اک بنائے گی (صلح نامہ)

فش ٹینک میں خیال بھی تیرنے لگا
ان مچھلیوں کے ساتھ مسلسل عذاب ہے
شیشے کے چومنے ہی میں لمسِ وصال ہے۔
دو پل کی نیند ہے، تو ہے بیداری تاحیات
ہر خواب ان کے حق میں گھڑی بھر کا خواب ہے
ان مچھلیوں کے ساتھ مسلسل عذاب ہے (آب گزیدہ)

دوستی پیرہن بدل کر جب
بے مزرد شمنی میں ڈھلتی ہے
وسوسے دوریوں کے دلدل میں
ایک نوزائیدہ کنول کی طرح
پھولتے پھلتے ہیں جسارت سے
وہ جسارت کہ جس کی شہ پاکر
نفرتوں کا یہ دلدلی کیچڑ
اپنے ہونے پہ ناز کرتا ہے (کم ظرف)

میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ نظام کی نظموں کا پیرایۂ اظہار منطقی اور کسی قدر نثری ترتیب لیے ہوئے ہے۔ اس صورت کو مندرجہ بالا مختصر نظموں کی بہ نسبت قدرے لمبی نظموں کے اقتباس میں بہتر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں فکر کی جو ملائمت سی ہے، اس نے نہ صرف لہجے میں گمبھیرتا پیدا کی ہے، بلکہ طرزِ اظہار میں ایک جمالیاتی شگفتگی کو بھی فروغ دیا ہے ؎

کھلونے لوٹ چکے
اب نقوش باقی ہیں
کھلونے والا مگر اب بھی جب محلّے سے
گذرتا ہے
مرے نوزائیدہ کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں
(یہ واقعہ ہی نہیں اصولِ فطرت ہے)
مگر یہ حیرت ہے
نہ جانے کیسے ابھی تک
کھلونے بیچنے والے کی بوڑھی آنکھیں بھی
مرے نوزائیدہ کی آنکھوں کا ساتھ دیتی ہیں (تجدید)

فقیرِ شہر ہوں اور بے ضمیر جیتا ہوں
عجب نشہ ہے ' طلب کی شراب پیتا ہوں
مگر یہ شہر سمجھنے سے مجھ کو قاصر ہے
ہر ایک شخص نیا غم اٹھانے حاضر ہے
تو پھر طلب کا مری
ان کے غم سے رشتہ ہے
یہ بوجھ ہلکا ہے
اسی لیے تو اٹھانے سے مجھ کو عار نہیں
یہ میرے فقر کے کاندھوں پہ کوئی بار نہیں (کوئی بار نہیں)

نظم "تجدید" اور اس قبیل کی دوسری نظموں میں روحانی اقدار کی بقا اور ان کے احیا کی خواہش نمایاں ہے۔ یہ وہ عنصر ہے جو ان دو دہائیوں کی نئی نسل کی شاعری میں بڑی حد تک مشترک ہے۔ زندگی کو بے معنی تسلیم کر لینے کی بجائے اسے آرٹ اور فن کے توسط سے معنی پہنانے کی آرزو' عقیدوں' جذبوں اور نظریوں کو غیر مشروط طور پر اپنے اندر سمیٹ ہی لیتی ہے۔ نظام نے اس عنصر کو اس دہائی کے چلن کی طرح نہیں اپنایا' بلکہ یہ ابتدائے سخن ہی سے ان کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی تمام تر شکایات اور احتجاج کے باوجود اہلِ انکار تو کیا' اہلِ تشکیک بھی نہیں ہے۔ عقیدے کا ڈورا ان کی شاعری میں جا بجا رینگتا نظر آ ہی جاتا ہے۔ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ نظام نے ان تازہ شعری محرکات کو اتباعی یا تقلیدی خطوط پر نہیں' بلکہ اپنی انفرادی سوچ کے ساتھ قبول کر کے موجودہ شعری منظر نامے کے محضر پر اپنے دستخط ثبت کیے ہیں' جو خاصے جلی بھی ہیں۔

اڑان نظام نے بھری ہے۔ سنجیدگی اور تحمل کے باوجود ان کے اندر کا شاعر جو سرکش بھی ہے اور اَنا پرست بھی۔ اس بات کا قائل نہیں کہ پرواز کے اس مرحلے میں حفاظتی تدابیر کا چارٹ پڑھ لے یا سر پر لٹکے ہوئے آکسیجن ماسک کا احتیاطاً معائنہ ہی کر لے۔ وہ تو سیٹ بیلٹ باندھنے کے حق میں بھی نہیں ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں کو آزادانہ سہتے ہوئے' کہیں کہیں غوطے اور ہچکولے کھانے کے باوجود

بقیہ صفحہ ۱۹۲ پر

نظام الدین نظام — ایک باغیانہ نظامِ فکر

ضمیر کاظمی

شاخِ گل سا بدن، گرجدار آواز، بوٹا سا قد، شربتی آنکھیں، سر پہ گھنے سیاہ بال، ...ڑی مونچھیں، لباس کے انتخاب میں ہندوستانی جمہوریت کی طرح آزاد کبھی جین کی پینٹ ر ٹی شرٹ، کبھی کرتا پائجامہ کبھی موجودہ ڈھیلے ڈھالے بیگی بلون کپڑے، سیماب ...راج، زبان کا تیز، دل کا صاف، مذہب پر اٹل اعتماد، شائستہ رکھ رکھاؤ، گفتگو میں ...جودہ عہد کی تیزی و طراری کے ساتھ اگلے وقتوں کی وضعداری، ہر وقت کسی نہ کسی ...نی پریشانی میں مصروف، شخصیات کے دوہرے چہروں پر غیض و غضب، دوستوں ...ے نالاں، اپنے ضمیر سے شرمندہ اعمال کے احتساب میں محصور، کبھی ہنستے ہوئے کبھی ...تے ہوئے، کبھی بچوں کے زخمی ہو جانے پر حد درجہ آزردہ باپ، کبھی ماں کا ذکر ...اہوا جذباتی بیٹا، کبھی ایک فکرمند بھائی —— اور کبھی ایک عاشق شوہر ...ہے جدید اردو غزل کے ابھرتے ہوئے نئے لب و لہجہ کا شاعر نظام الدین نظام۔ ...یا اس کی اکثر ملاقاتوں میں اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ پچھلی ملاقات کا کوئی عکس شعور نہیں رہ ...تا مگر اپنی کم فہمی، کمزور یادداشت اور نظام سے انتہائی مصروف لمحوں میں مختصر ...قاتوں کا تاثر کچھ اسی قسم کا ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شاعری عقل اور مادّہ کے درمیان ایک تجزیاتی عمل ہے ...پھر اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ زبان بلّور کا وہ شفاف پیمانہ نہیں ہے کہ جس ...ے آر پار دیکھا جا سکے کہ ہر زبان کی اپنی تہذیب، اپنا اسلوب اور اپنا مزاج ہوتا ہے۔ محسوسات کے زاویے یکساں نہیں ہوتے ورنہ ہر تجزیہ، ہر نظریہ اذہان کیلئے

۱۲۹/۱۳۲، پائپ روڈ، کرلا، بمبئی ۴۰۰۰۷۰
...یل بھیونڈی

قابلِ قبول ہو جاتا اور کائنات ایک بے رنگ سیّارے میں تبدیل ہو جاتی۔ ذہنی افق پر پھیلے ہوتے رنگین لہرئے انسانی جذبات کو مختلف منازل سے گذارتے ہیں اور وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار اپنے لفظوں میں بیان کرنے کے لئے کسی اسلوب کی تلاش میں مصروف ہو جاتا ہے شاعر کسی سائنٹسٹ کی طرح ذہنی تجربہ گاہ میں محسوسات کے "مادّہ" کا تجزیہ کر کے جب دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو سننے والے چیخ اٹھتے ہیں کہ شاعری جزو یست از پیغمبری"۔

جب پانی بھاپ بن کر بادل میں تبدیل ہوتا ہے اور سرد ہواؤں سے ٹکرا کے برستا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بارش ہو رہی ہے تب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بارش کا یہ عمل خود اپنی ہی بازگشت ہے۔ اس کی آسان سی مثال فوارے کی ہے جس کا پانی ایک خاص بلندی تک سعود کرتا ہے اور پھر اپنے ہی قدموں پر گر پڑتا ہے شاعری بھی بالکل یہی عمل ہے کہ کوئی اظہار نیا نہیں ہے اور ادب ایک کائناتی گونج ہو سکتا ہے مگر اسکی اپنی جڑیں آفاقی صداقتوں Universal Facts سے ماورا نہیں ہیں۔ حالانکہ احساس کے بہت سے جذبے ابھی تک غبار میں ملفوف ہیں اور لذّتِ اظہار سے محروم خیال و فکر کے شاہین لفظوں کے دائروں میں قید ہیں زبان کا افق ابھی اتنا وسیع نہیں ہوا ہے کہ ہر جذبے کو اظہار کی سعادت بخش سکے۔ اس کے باوجود دنیا کا ہر شاعر ہر مفکر اپنے اپنے دائرہ عمل میں مصروفِ کار ہے۔

اور پھر نظام الدین نظام کا ماحول تو وہ مادّی قید خانہ ہے جہاں بڑے بڑے آزاد خیال زندانی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے لہو لہان ہوئے اور عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ نظام کا المیہ ہی یہی ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور اپنے انجام سے بے خبر نہیں ہے۔ یہ تجزاس کی شاعری میں برہمی، تلخی اور چڑ چڑے پن کی جھلکیاں ہیں یہ اس کی زود فہمی کا نتیجہ ہیں وہ اچھی طرح سمجھتا ہے لورڑوا آئڈیالوجی اسی مجرمانہ فعل میں گرفتار ہے کہ زبان کے آئینہ دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کا ایقان ہے کہ غالبؔ کے بعد اردو غزل ختم ہو گئی۔ اپنے اسی مفروضے کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے وہ اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کچھ ایسی بے چارگی سے کرتا ہے کہ لوگوں کو یقین آجاتا ہے کہ واقعی غزل میں نظامؔ (بے چارہ) کیا کرسکتا ہے

غالبؔ کے بعد اردو غزل مر گئی نظامؔ
مردے پہ ایسا کون سا منتر کروں گا میں

غالبؔ کے طرف دار نظامؔ کو یہ بات کون بتائے کہ لفظ "مردے" اور "منتر" تو غالبؔ بھی غزل میں نظم کرنے کی جراَت نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے نظامؔ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود زیادہ بہتر سمجھتا ہے، مگر اپنی فطری جھلاہٹ کو کہاں لے جائے۔ یہ جھلاہٹ جا بجا کچھ یوں نمودار ہوتی ہے کہ لہجہ سفاک ہو جاتا ہے اور تیور جارحانہ ہو جاتے ہیں اور پھر غزل کی شائستگی، رکھ رکھاؤ اور لطافتیں اسے داخلے کی اجازت دیں یا نہ دیں، وہ اظہار کی منزلوں سے درآنہ گذرتا ہے اور غزل کے دائرے میں "خوارج" کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے مثلاً

اٹھو اور چادریں سرکش ہوا کے منہ پہ دے مارو
ہمارے سر کھلے ہیں، پاؤں بھی باہر نکلتے ہیں

یہ گھر، یہ دفتر، یہ میکدہ، یہ دماغ و دل، یہ سیاہ بختی
کسے خبر تھی بہشت لے کر وہ ایسے ایسے عذاب دے گا

دانتوں کے کچھ نشان مری پنڈلیوں پہ ہیں
سوچا تھا سب گلی کے ہیں مجھ پر نہ آئیں گے

لہو اک کشمکش بن کر اتر آتا ہے آنکھوں میں
ہرن کے جسم میں جب شیر کے پنجے اترتے ہیں

بھیگے ہوئے بادل کی تمنا ہی کسے ہے
صحرا میں مرا کام تو ٹھوکر سے چلے گا

زمانے بھر کو سناتے ہیں غزل اپنی
نظام رائیگاں اپنا ہنر نہیں کرتے

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ جھلاہٹ اس کا مزاج بن گئی ہے۔ وہ ہر معاملے میں انتہا پسند ہے کہ عشق کے روایتی موضوع بھی اپنے انداز سے بیان کرتا ہے۔ غنائیت اور کشش جب اس کے وجدان پر اثر انداز ہوتی ہیں تو وہ سرتا پا "کارگاہ شیشہ گراں" بن جاتا ہے۔ جیسے

ستارے ریشمی دامن میں آنکھوں سے اترتے ہیں
شبِ مہتاب جیسے جھیل میں بجرے اترتے ہیں

میں اکثر نیند کی راحت غزل کی نذر کرتا ہوں
فلک سے نیمِ شب اکثر فرشتے سے اترتے ہیں

ہم آنسوؤں میں نہیں، دھڑکنوں میں جیتے ہیں
مگر وہ آنکھ سے دل تک سفر نہیں کرتے

سرسبز چاہتوں کے یہ منظر نہ آئیں گے
موسم گذر گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے

ہر ایک شعر اُسی سوچ کے اثر میں ہے
بہت دنوں سے وہ چہرہ مری نظر میں ہے

میری خاطر میں اک دن زمیں پر بھی اترنا ہے
کہ میں تپتا ہوں صحرا ہوں اور کالی گھٹا تم ہو

لیکن اس کا یہ انداز جوش کی غزل جیسا ہے۔ نظام کی شاعری معاشرتی شاعری ہے۔ جدید معاشرے کی آسودگی سے مفاہمت کی ناکامی پر اس کی جھلاہٹ مجروح انانیت کا سراغ دیتی ہے۔ اور تب محسوس ہوتا کہ اس کی شاعری کے ڈانڈے معاشرے کی ان دشاؤں سے ملتے ہیں جو نظام کی فکر کا ہدف ہیں۔

ستارے، شبِ مہتاب، جھیل، دھڑکنیں، موسم، منظر، چاہتیں، چہرہ، صحرا، اور کالی گھٹا نہ اس کی جولاں نگاہ ہے اور نہ منتہائے نظر، نظام سے ایسے اشعار سن کر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وار کرنے کے پینترے، رقص کے قدم Steps میں تبدیل ہو گئے ہوں۔ موضوعاتی تنوع، جارحانہ اسلوب، نامانوس الفاظ کا انتخاب، تجسس، غیض، لہجے کی نشتریت ہی اس کا تشخص ہے اور آئندہ غزل کی آہٹ بھی ــــ یہ بات میں بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں ورنہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ نظام کو غزل سے زیادہ نظم پر زور دینا چاہیے۔

اس کی شاعری مجھے اس لیے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ وہ حقیر و بے مایہ لفظوں میں بڑے بڑے فلسفے نہیں پیش کرتا بلکہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے فلسفوں کے زاویے تلاش کرنے کے عمل سے گذرتا ہے۔ ~

مری پرواز کا منظر ابھی تیروں سے چھلنی ہے
لہو میں تر بتر ہے داستان نقلِ مکانی کی

چمک رہا ہے دور تک مفاہمت کا راستہ
طلب کی رہ نمائی میں انا کہاں چلی گئی

زمیں میں کس نہیں ہو تو گھٹائیں خون روتی ہیں
جڑوں میں رس نہیں ہو تو ثمر اچھا نہیں لگتا

جنگلوں کی سمت سے آوازِ دف آنے لگی
کیا اساطیری بلا گھر کی طرف آنے لگی

سفر یہ یوں معرہوں میں کہ حوصلوں میں جان ہے
جو لٹ گیا یقین تھا جو بچ گیا گمان ہے

ایک چنگاری نے اپنے آپ کو منوالیا
جل گئی کشتی سمندر ہاتھ مل کر رہ گیا

یہ اور اس قسم کے متعدد اشعار اس کی غزلوں میں اس کی فکری "بڑے پن" کا پتا دیتے ہیں اس کی شاعری میں کہیں کہیں تموج اس قدر شدید ہے کہ پیش گوئی کرنے کو جی چاہتا ہے

ع منزلوں کی بات ہے راستے میں کیا کہوں

بقول خود نظام الدین نظامؔ ؎

یہ تجسس یہ سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں ہی ہر موڑ پر منزل کا گماں ہوتا ہے

●●

نئے شگوفے

تصنیف : کنھیالال کپور
تالیف : اندرجیت لال
مبصّر : یوسف ناظم

اندرجیت لال خود مصنّف اور مترجم ہونے کے باوجود شریف آدمی ہیں جبھی تو انھوں نے کنھیالال کپور کے ہم سب سے جدا ہونے کے بعد اُن کے مضامین کو جمع کیا۔ اور چھپوایا ورنہ مصنّف توصرف اپنی ہی کتابوں کی اشاعت کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتا ہے اندرجیت لال اگر یہ کتاب نہ چھاپتے تو اُن سے کوئی بازپرس تو ہوتی نہیں۔

کنھیالال کپور کے مزاح یعنی صاف ستھرے مزاح اور طنز یعنی کیٹیلے اور نکیلے طنز کے بارے میں لکھنا اس لئے غیر ضروری ہے کہ اُن کے شیدائیوں اور سودائیوں کو سب پتہ ہے۔ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تو اپنی پہلی تصنیف سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس کھیل کے زبردست اسپین بولر ہیں ـــــ زیرِ نظر کتاب ۲۶ مضامین پر مشتمل ہے اور ہر مضمون میں مزاح کے علاوہ دُور چانٹ نکتے ایسے ضرور مل جاتے ہیں جو کنھیالال کپور کے اختراعی دماغ کی پیداوار ہوتے ہیں مثلاً۔

"عورت مرد کی پسلی سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے پسلی کی طرح اس کا دماغ ٹیڑھا مزاج ٹیڑھا اور فطرت ٹیڑھی ہے۔ جذباتی لحاظ سے وہ مرد کی نسبت زیادہ متوازن ہوتی ہے اسی لیے پاگل خانے مردوں سے بھرے پڑے ہیں کم از کم دو درجن بیماریاں ایسی ہیں جو عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً گھٹیا گنجا پن .... یہ مضمون انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب عالمی پیمانے پر عورتوں کا سال منایا گیا تھا۔

"کہاوتیں دھکا دیتی ہیں۔ ہر کہاوت کے پیچھے کپور کی ذہانت (شرارت سے ملتی جلتی ہے) موجود ہیں اور اُن کی لغاتِ جدید تو اب بھی زیرِ استعمال ہے۔ اخباروں کے مزاحیہ کالم میں جب بھی جھول محسوس ہونے لگتا ہے ایڈیٹر صاحبان کنھیالال کپور کی لغاتِ جدید سے شگفتگی مٹا دیتے ہیں

کنھیا لال کپور نے اردو ادب کو تصنیفات دیں لیکن ان کے پاس اور بھی ذخیرہ تھا جو چھپنے سے رہ گیا تھا۔ انہوں نے اخباروں اور ریڈیو اسٹیشن وغیرہ کے لئے بہت کچھ لکھا۔ ہندی میں بہت چھپے۔ لکھنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی الگ تھا۔ کیوں کہ انھوں نے تقریباً گوشہ نشینی میں زندگی گذاری۔ باہر نکلتے شاید ڈرتے تھے کہ کہیں جھگڑے نہ چل رہے ہوں۔ میں کہاں ان سے لڑ سکوں گا گھر بیٹھے قلندرانہ زندگی گذاری اور خوب خوب لکھا۔ انھوں نے بہت اسٹیشنری خرچ کی اور مفید کام میں خرچ کی ظرافت مفید کام تو ہے ہی لیکن اس کا فائدہ کام دیکھنے والے کو زیادہ پہنچا ہے اور کام کرنے والے کو کم اور کبھی کبھی بالکل نہیں۔ (اسے ستم ظریفی کہتے ہیں)

وہ اردو کے ادیب تھے لیکن انگریزی کے پروفیسر تھے۔ اسی لئے وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ادیبوں سے واقف تھے۔

ایک جگہ لکھا ہے۔ "ٹالسٹائی، کارلائل اور غالب اپنی اپنی بیویوں کو کبھی خوش نہ کر سکے کاش انھیں اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے یہ گر معلوم ہوتے.....میں تو اس جملے سے اپنی حد تک یہ سمجھا کہ غالب کا مقابلہ مضمون گو ٹٹے سے نہیں' ان دونوں حضرات سے بھی کیا جا سکتا ہے (الگ الگ میدانوں میں) ______ آغا نجر، حاذق صاحب فضول صاحب اور ان کے تلامذہ وغیرہ۔

مضامین میں کچھ لوگوں کو (جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے) اپنی جھلک نظر آئے گی یہ نقصان دہ نہیں ہے۔ یہ جھلک، اصل میں آپ کو علاج معالجے کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دلاتی ہے علاج معالجے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنا احتساب خود کرے خود احتسابی کو اچھے اعمال نامے کی بنیاد کہا گیا ہے۔ اندرجیت لال ایسا معلوم ہوتا ہے ذرا عجلت میں تھے۔ کنھیا لال کپور کے مضامین اس سے بہتر کتابت طباعت اور کاغذ کے مستحق تھے۔ خیر یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو چھاپ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، جو انھیں کپور صاحب سے تھی ہے اور رہے گی۔ کتاب میں ان کا مقدمہ "طنز و مزاح میری نظر میں" بھی شامل ہے۔ کتاب پر مؤلف کا بھی تو کچھ نہ کچھ حق ہوتا ہے۔ یہ باطل نہیں کہا جا سکتا۔ میری سفارش کون سنے گا لیکن بہر حال میں اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کروں گا.....

اور درویش کی صدا کیا ہے؟

مصنف: ایم کوٹھیاوی راہی
مبصر: ایم مبین

لہر لہر ایک ناؤ اکیلی' ایم کوٹھیاوی راہی کے نو ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے ریڈیائی ڈرامہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس پر ڈرامہ کی طرح ہی توجہ نہیں دی گئی مگر پھر بھی اس صنف کو پروان چڑھانے میں اردو کے تقریباً تمام بڑے ادیبوں نے ہاتھ لگایا سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ ریڈیو سے وابستہ رہے اور اسی دور میں انہوں نے ریڈیو کے بہت اچھے ڈرامے لکھے منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ "منٹو کے ڈرامے" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے بیشتر ڈرامے منٹو کی مشہور کہانیوں پر مبنی تھے۔

آزادی کے بعد اردو کے ادیبوں نے اس صنف کی طرف کم توجہ دی اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے اہم وجہ ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو پروگراموں کا خاتمہ ہے۔ آکاش وانی کے سیکڑوں مراکز میں سے چند ہی ایسے مراکز ہیں جن سے باقاعدگی سے روزانہ صرف آدھا ایک گھنٹے کے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ اس آدھا یا ایک گھنٹے میں اردو ڈرامے کے لیے گنجائش نکال لینا بہت مشکل ہے۔ اگر گنجائش نکل بھی گئی تو اچھے اردو ڈرامے نہیں ملتے۔ اگر ڈرامے مل بھی گئے تو ان ڈراموں کے لئے اردو کی اچھی آوازیں نہیں مل پاتیں۔

پھر ریڈیائی ڈرامہ لکھنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ کردار نگاری، منظر نگاری جذبات، احساسات، واقعات تمام چیزوں کو مصنف کو مکالموں کے ذریعے پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک افسانے سے زیادہ ڈرامہ پر محنت کرنی پڑتی ہے بعض اوقات مصنف تو ان تمام چیزوں کو بڑی محنت سے ریڈیائی ڈرامے کی شکل میں ڈھال دیتا ہے۔

لیکن ڈرامے کے لئے آواز دینے والے فن کار اس فن پارے سے انصاف نہیں کرپاتے اور ڈرامہ بے جان ہوجاتا ہے۔

عام طور پر ریڈیو کے ڈرامہ نویسوں نے ایک نہج بنائی ہے کہ ہر ڈرامہ کا اختتام المیہ ہوگا۔ ایم کو ضیاؤ الدین راہی کے ڈراموں میں بھی یہی رجحان ملتا ہے۔ ویسے عموماً ریڈیائی ڈرامے آغاز سے درمیان میں پہنچنے کے بعد المیہ کی طرف مڑتے ہیں لیکن ایم کو ضیاؤ الدین راہی کے زیادہ تر ڈراموں میں کرداروں پر حزن و ملال و غم کی کیفیت شروع ہی سے طاری رہتی ہے اور شروع سے آخر تک المیہ کی چھاپ چھائی رہتی ہے۔

مجموعہ کے پہلے ڈرامہ "ایک آنچل لاکھ پرچم" میں یہ کیفیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ڈرامے کے آغاز میں ہی ڈرامے کے مرکزی کردار نادر اور زلیخا کی حسرت و یاس میں ڈوبی گفتگو ڈرامے کی کیفیت کا پتہ دے دیتی ہے۔ اس وجہ سے ڈرامے میں جو ایک نمایاں کمزوری ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف سامعین کے دل میں تجسس جگانے میں ناکام رہتا ہے اور سامعین آغاز میں ہی انجام سے باخبر ہوجاتے ہیں مجموعے کے دوسرے ڈرامے "ہم کا الاؤ" کی بھی یہی کمزوری ہے۔ ڈراموں میں جگہ جگہ مکالموں کی تکرار اور طوالت بھی کھٹکتی ہے (ویسے اس کے لئے راہی صاحب کو دوش نہیں دیا جاسکتا۔ کبھی کبھی مصنف کو وقت کی قید کی وجہ سے بھی مجبوراً ان چیزوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے) راہی کے ڈراموں میں فلیش بیک کی تکنیک بہت اچھی ہے۔

ڈراموں کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راہی نے یہ ڈرامے ریڈیو اسٹیشن کے دیئے گئے موضوعات پر لکھے ہیں جیسے پہلے ڈرامہ میں آزادی نسواں اور برابری کا موضوع تو دوسرے ڈرامے کا موضوع قومی یکجہتی۔ ایسی صورت میں مصنف کا قلم ایک مخصوص دائرہ میں قید ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ تخلیق کے ساتھ صحیح طور پر انصاف نہیں کرپاتا۔

راہی نے ڈراموں میں جگہ جگہ شعروں اور نظموں کا استعمال کیا ہے۔ جو ڈرامے میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

"جانا ضروری ہے" میں استعمال کی گئی نظم اور آزاد نظم بڑی خوبصورت ہے
یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ ۴۵۰ صفحات کی اس کتاب میں صرف نو ڈرامے شامل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کی کتابت بہت موٹی ہے۔ اگر کتابت تھوڑی باریک کی جاتی تو کتاب کے صفحات کم ہوتے اور ڈراموں کی تعداد بھی بڑھ جاتی۔ اور قیمت بھی کم ہو سکتی تھی
ویسے آجکل ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے شکل سے شائع ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں "لہر لہر ایک ناؤ" اکیلی کی اشاعت غنیمت ہے۔ لیکن اگر کتاب کی قیمت کم ہوتی تو شاید یہ باذوق حضرات تک پہنچ سکتی تھی۔ اور اس میدان کے نئے کھلاڑی اس کتاب کے ڈراموں کو پڑھ کر ریڈیائی ڈرامے لکھنے کی تکنیک سیکھ سکتے تھے۔

تلاشِ فن (تنقید)

مصنف : ڈاکٹر یونس اگاسکر
مبصر : عین رت

تلاش فن میں پندرہ مثبتی تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ یہ ایک علاقائی کتاب ہے مگر ادب میں فن سے پہچان ہوتی ہے علاقہ پروری سے نہیں۔ یونس اگاسکر نے جن فنکاروں کے فن پر روشنی ڈالی ہے وہ قابلِ احترام ہیں۔ اس میں دو رائے نہیں کہ جب بھی اردو ادب کی نئی تاریخ مرتب ہوگی یہ کتاب معاون ثابت ہوگی۔
تلاشِ فن کا پہلا مضمون بدیع الزماں خاور (مرحوم) کے اولین شعری مجموعہ "حروف" پر حروف شناسی کے نام سے قاری کی نظروں سے گذرتا ہے۔ موصوف نے خاور کے فکر و فن کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ مضمون میں ایک لفظ "سناتن" کا استعمال بہت ہی پیارے انداز میں ہوا ہے " لیکن اس میں لمسی لذت کوشی یا بدن [illegible] کو بہت کم دخل ہے اس لحاظ سے خاور خاصے "سناتن" واقع ہوئے ہیں [illegible] سناتن لفظ کا استعمال اس لیے پسند آیا کہ وہ خالص ہندوستانی ہے اور جیکہ

تنقید میں English terms کا چلن ایک فیشن ہوگیا ہے اگاسکر صاحب نے ہندی شبد کو بہتر طور پر برت کر ہندوستانی تنقید نگار ہونے کا حق ادا کیا ہے۔

داؤد غازی کے شعری مجموعہ "وقت کی صدیاں" پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے فکر و فن کا خاصہ جائزہ لیا گیا ہے۔ ساحر شیوی "صحرا کی دھوپ" میں اگاسکر صاحب نے ان کے فن کے ساتھ ساتھ شخصیت کا بھی اچھا کیرکٹر کیا ہے۔

یعقوب راہی کی تصنیف پر ایک اچھا تنقیدی مضمون دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ مضمون نوجوان تنقید نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس میں تنقید کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں اسے مثبتی تنقید کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ فیضی نظام پوری کی کتاب "زخموں کا پھول" پر ایک جامع تبصرہ ہے۔

ڈاکٹر ظفر اسلام ظفر کی تصنیف "کچھ ورق کا جائزہ بعنوان" ورق گردانی" میں اگاسکر صاحب نے چند جگہوں پر اچھا تنقیدی نظریہ پیش کیا ہے۔ مگر صابانی کی کتاب "آئین وطن" پر سیر حاصل تبصرہ نہ کرسکے "شارع اول" جناب مہر ردولوی مرحوم پر بھی اظہار خیال سرسری رہا۔ شرف کمالی کی تصنیف پر بھی ہلکی ہلکی نگاہ ڈالی گئی۔ شیخ اسماعیل کے مجموعہ "ڈھلتا سورج" پر بھرپور تبصرہ دیکھنے کو ملتا ہے"۔ منزل کہاں ہے تیری" مضمون میں نور پرکار کی کتاب پر تنقیدی راست گوئی اور دیانتداری سے کام لیا گیا ہے"۔ کہکشاں اور لہو کے چراغ" انجم عباسی صاحب پر نگاہ زیادہ اور فکر پر کم ڈالی گئی ہے۔ یادگار یوسف" کے اقتباس سے ہم سو سال پیچھے یعنی ماضی میں جھانکتے ہیں۔ ماضی کی زبان سے واقف ہوتے ہیں یہ مفصل اور جامع مضمون ہے۔

محمد احسن مقبراوری ان کی شاعری اگرچہ ۱۴ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے مگر اس مضمون میں جناب اگاسکر صاحب کی رائے صرف ایک صفحہ کی ہے ½ صفحہ میں ڈاکٹر میمونہ دلوی صاحبہ کا ایک اقتباس ہے باقی احسن صاحب کی کوئی شاعری۔ البتہ حاشیہ میں معنی اگاسکر صاحب نے بیاں کیے ہیں۔ موصوف اس مضمون میں کوئی لسانیات یا زباں کی تاریخ پر تھوڑی روشنی ڈالتے تو اس مضمون کی اہمیت اور افادیت بڑھ جاتی

"پریشانی" سے پرواز تک" مضمون میں رشیدہ قاضی صاحبہ کے فن پرکم Personal Relationship پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

تلاش فن مجموعی طور پر ایک اچھی تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگاسکر صاحب نے دوستی اور فن کو الگ رکھا اور تنقیدی اصولوں برتا رہتے ہوئے راست گوئی سے کام لیا۔ بزرگوں کے احترام کو مخلوط رکھا۔ ادب در علاقائی عصبیت پسندی سے پرے جو فنی جائزے پیش کیے ہیں۔ اس کے لیے وہ قابل ستائش اور تحسین ہیں۔

کوکن کے سپوت

مرتب : انجم عباسی، شیخ اسماعیل
مبصر عین دت

"کوکن کے سپوت" دفتر دوم (Volume II) کوکن کے ادباء (زبان اردو) کی سوانح عمری اور انٹرویوز پر مبنی ایک DOCUMENTARY BOOK ہے۔ س کتاب کی اہمیت اور افادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اِسے بلا تبصرہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کتاب پر تبصرہ سے زیادہ تذکرہ کیا جائے تو حق مرتب ادا ہوگا۔ اس ں دستاویزی اہمیت کے لیے جناب انجم عباسی جناب شیخ اسماعیل صاحب کو جتنی مبارک باد پیش کی جائے کم ہے مرتبین نے کتنی اہل قلم ہونے کا صحیح حق ادا یا ہے اور اپنے لوگوں کو جن میں بیشتر حضرات سیاسی، سماجی یا ادبی خدمات کی بنا پر مروف ہیں اور کچھ غیر معروف بھی تھیں، یکجا کیا ہے۔ یہ واقعہ روشنائی سے کم نہیں۔

جناب انجم عباسی صاحب کی خدمات پر روشنی ڈالنا مقصد تو نہیں ہے تاہم انکے نعلق سے کچھ نہ کہنا بھی لفظی بے مائیگی کی دلیل ہوگی۔ آپ ارض کوکن کے نامور معتبر سان ہی نہیں بلکہ ایک اچھے تخلیق کار اور شاعر بھی ہیں۔ بے لوث، خادم قوم وسماج ر اپنی مٹی سے بے پناہ محبت رکھنے والے انسان بھی یوں تو تخلیقی طور پر بہت کارہائے

نمایاں انجام دیتے ہیں گمان کی یہ تصنیف اردو ادب کے کوکن مورخ کی صورت میں آپ کو مرتبہ بھی عطا کرے گی آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کریں گی۔ اسی طرح شیخ اسماعیل بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے بغیر یہ کتاب ممکن ہے کہ ادھوری رہ جاتی۔

اس کتاب میں ۹۔ انٹرویوز، ۲۲ موجودہ قلمکاروں کی سوانح عمری اور ۲۲ مرحومین کی یادیں ہیں ہر chapter بڑی دیانتداری کے ساتھ تحریر عمل میں لایا گیا ہے۔ انٹرویوز کے حصہ میں انٹرویوبیز Interviewee نے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف خیالات احساسات کو عوام تک پہنچایا ہے۔ مگر آخری حصہ میں کوکن کے سپوت (جلد اول) کے بارے میں اظہارِ رائے شائع کی گئی ہے۔ یہی حصہ قاری کو تھوڑا کھٹکتا ہے ایسا لگتا ہے کہ موصوف نے ستائش حاصل کرنے کی غرض سے اسے شامل کیا ہے۔ سرورق سے لے کر پشت اور درمیانی صفحات تک کتاب دیدہ زیب، خوش طبع ہے۔ کتابت اچھی ہے کاغذ دبیز استعمال ہوا ہے۔

"کوکن کے سپوت" صرف اور صرف ایک دستاویزی کتاب ہے اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ امید ہے اس کی پذیرائی بھی ہوگی۔ کوکن اردو رائٹرز گلڈ نے اسے شائع کر کے نظرانداز کیے جانے والے حضرات کو منظر عام پر لایا اور ان کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے لہٰذا ذمہ داران گلڈ کی کوشش قابل ستائش ہے۔

اُمید ہے گلڈ آئندہ بھی لگن کے ساتھ کام کرتی رہے گی اور مزید اہم تصنیفات سے اردو ادب میں اضافہ کرتی رہے گی۔ ●●

گ ذ ا ر ش	○ تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال فرمائیں ○ ایک جلد بھجوانے پر تبصرہ شائع نہیں کیا جائے گا۔ ○ تبصرے مختصر ہوں۔ ○ تخلیقات کی زیروکس کاپی نہ بھجوائیں، ○ تخلیقات صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔

چہل پہل

مرتب: مقصود اظہر

ایک ستون اور گرا

۳۰ جنوری سنہ ۹۱ء کو عالمی شہرت یافتہ صاحب طرز ادیب، صحافی و نقاد جناب ظ۔انصاری صاحب شب میں آٹھ بجے بمبئی کے ایک مشہور اسپتال میں رحلت فرماگئے۔ جو گذشتہ کئی دنوں سے جگر کے سرطان کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ ظ۔انصاری اردو ادب کی ایک باوقار اور معتبر شخصیت تھے۔ جن کا نام ان کی انفرادی طرزِ تحریر کے سبب اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ مرحوم بمبئی یونیورسٹی کے غیر ملکی شعبے کی سربراہی سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور وہ روسی زبان کے ماہر نیز فارسی، عربی پر بھی خاصی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں اردو حلقوں میں مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔ مرحوم ۱۹۲۶ء میں یو۔پی کے ایک شہر سہارن پور میں پیدا ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ

صدر شعبۂ اردو ماہر لسانیات

ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو مراٹھی کے ناول نگار دشرام بیڈکر کے مشہور ناول "رن آنگن" کا اردو ترجمہ کرنے پر سنہ ۹۰ء ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی مراٹھی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اس سے قبل بھی انھوں نے مراٹھی شہ پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

ہم تکمیل رائٹرس گروپ، کردار آرٹ اکادمی اور بزم فرزاں موصوف کی خدمت اس گراں قدر ایوارڈ ملنے پر ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

پنڈت آنند نرائن ملا کو اقبال سمان انعام

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر جناب پنڈت آنند نرائن ملا کو بھوپال کا ایک لاکھ روپئے کا "اقبال سمان" ایوارڈ ملا ہے۔ اب تک ملا صاحب کے چھ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ "جوئے شیر" "کچھ ذرے کچھ تارے" "میری حدیث عمر گریزاں" "سیاہی کی ایک بوند" "کرب و آگہی" وغیرہ ان کا آخری مجموعہ کلام "جادۂ ملا" ہے جو ۱۹۸۸ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوا ہے۔ ملا صاحب کو بڑی تعداد میں انعامات ملے ہیں۔ ان میں ساہتیہ اکادمی انعام بھی شامل ہے ●

جگن ناتھ آزاد کی ہندوستان واپسی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو نومبر ۱۹۹۰ء کے دوسرے ہفتے میں ڈاکٹر عبداللہ جنرل سکریٹری علی گڑھ الیومنائی ایسوسی ایشن واشنگٹن (ڈی سی) کی دعوت پر شمالی امریکہ گئے تھے دو ماہ امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کرنے کے بعد وطن واپس آ گئے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا میں آپ واشنگٹن کے علاوہ ورجینیا، شکاگو، لاس اینجلس اٹلانٹا، میامی، ہیوسٹن، کلیولینڈ، سین تیسنی، نیویارک، ٹورنٹو اور بعض دوسرے شہروں میں گئے۔ جہاں انھوں نے مشاعروں میں شرکت کی اور یونیورسٹیوں میں اور مختلف علمی اور ادبی جماعتوں کے زیر اہتمام لیکچر دیئے۔

شکاگو میں ساؤتھ ایشیا پرفارمنگ آرٹس کونسل آف امریکہ کے زیر اہتمام جگن ناتھ آزاد کے مجموعہ کلام "بوئے رمیدہ" کے ہندوستانی ایڈیشن کی رسم رونمائی مشہور پاکستانی شاعر افتخار نسیم نے انجام دی۔ تقریب کی صدارت کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے پروفیسر سید عابد اللہ غازی نے فرمائی۔ دو برس قبل نفیس اکیڈمی کراچی ادارہ ادبیات اردو کراچی اور پاکستان آرٹس کونسل کراچی کے زیر اہتمام "بوئے رمیدہ" کے پاکستانی ایڈیشن کے رسم رونمائی اردو کے ایک ہندوستانی عاشق جناب علی صدیقی صدر عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی نے کراچی میں انجام دی تھی۔

ٹورنٹو میں مشاعروں میں ... اور لیکچر دینے کے علاوہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے عابد جعفری کے مجموعہ کلام "جاگتی آنکھوں کے خواب" کی رسم رونمائی بھی انجام دی

"ڈاکو طے کریں گے"

پچھلے دنوں جدید لب و لہجے اور اپنے اسلوب کے منفرد افسانہ نگار جناب م ناگ کے اولین افسانوی مجموعہ "ڈاکو طے کریں گے" کی تقریب رسم اجراء عمل میں آئی جس کا اہتمام کرلا کی فعال بزم کردار آرٹ اکاڈمی اور تکمیل رائٹرس گروپ نے کیا۔

سب سے پہلے کردار آرٹ اکادمی کے روحِ رواں جناب اقبال نیازی نے تمام مہمانان اور صاحبِ اعزاز جناب م ناگ اور سامعین کا استقبال کیا۔ اور پروگرام کو اناؤنسر مظہر سلیم کے حوالے کیا۔ اس موقع پر جناب سلام بن رزاق نے اپنا بیانیہ سنایا۔ انہوں نے م ناگ کے تمام افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ اور م ناگ کو عہد کا اہم افسانہ نگار ثابت کیا۔ اسی طرح م ناگ کے ایک دیرینہ ساتھی جناب عبدالرحیم نشتر نے م ناگ سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا۔ اور چھوٹا سا مضمون نذرِ سامعین کیا۔ ممبئی کے ایک اور اہم افسانہ نگار جناب انور خان نے م ناگ کے افسانوں کا ایک الگ انداز سے جائزہ پیش کیا۔ جناب انور قمر نے م ناگ کے افسانوں میں تنقیدی پہلو تلاش کئے اور ایسے افسانوں کی نشاندہی کی جو کمزور ہیں۔ جناب ساجد رشید نے م ناگ کے انوکھے اسلوب کی تعریف کی۔ جناب اسلم خان نے م ناگ کے افسانوں کا ایک سرسری تجزیہ پیش کیا۔

جناب ندا فاضلی نے الفاظ کو استعمال کرنے اور برتنے پر بحث کی انہوں نے م ناگ کو اتنے خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دی

آخر میں صدر جلسہ جناب سریندر پرکاش صاحب نے کہا کہ میں م ناگ کے افسانوی مجموعہ کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کرتا ہوں کہ ایسے پر آشوب دور میں اردو کی کتابیں بہرحال شائع ہو رہی ہیں۔ انھوں نے جلسہ کا اہتمام کرنے والوں کو بھی مبارکباد دی اور مضامین پڑھنے والوں کو بھی ۔۔۔

اردو ادب کے چالیس سال

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا سیمی نار

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے زیرِ اہتمام ۲۸ر تا ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو اردو ادب کے چالیس سال کے موضوع پر سیمینار اور کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

۲۸ر دسمبر کو افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر جاوید خان (صدر اردو اکیڈیمی) نے فرمائی۔ یوسف ناظم (ممبر سیکریٹری) کی تعارفی تقریر کے بعد اکیڈیمی کے ڈائرکٹر علی سردار جعفری نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا، "اردو معاشرہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے اردو کا مرکز کہا جاتا تھا۔ اب تہذیب و تمدن سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، اب صرف جزیرے رہ گئے ہیں۔ آزادی کے چالیس سال بعد بھی ہمارے ملک کے جمہوری نظام کے سائے میں اردو زبان زندہ ہے۔ اردو کے نام پر ارباب حکومت سے صرف رعایتیں اور مہربانیاں تو ملی ہیں، اس کا جائز حق نہیں۔"

وزیرِ شہری ترقیات سوشیل کمار شندے نے افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب ہمارا سب سے بڑا سرمایا ہے، ادیب، شاعر اور فنکار ہمارے تہذیبی سفیر ہیں۔" گیان پیٹھ انعام یافتہ ادیبہ قرۃ العین حیدر نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "فنونِ لطیفہ اور ادب کی آبیاری کے لیے جس آزاد خیالی کی ضرورت ہے وہ فضا مہاراشٹر میں ملتی ہے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ترقی پذیر ریاستوں میں شہر بمبئی کی روشن خیالی سارے برصغیر میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔" مہمانوں کی گل پوشی کے بعد حکومت کے گورو سمان یافتہ ادیبوں کو اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، اور سریندر پرکاش کو تہنیت کے ساتھ شال اور قلم کا تحفہ پیش کیا۔

اخترالایمان نے فرمایا کہ "اب اردو کی بقا   کا دارومدار مجھ پر ہے کیوں کہ میرے ہم عمروں نے اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ معاش کے لیے اردو نہیں پڑھتے ہیں وہ اردو کو قتل کر رہے ہیں۔" سریندر پرکاش نے حاضرین سے فرمایا کہ "انگریزی بولنے والے کو تعلیم یافتہ سمجھا جاتا ہے اور اردو

ینے والے کو مہذب سمجھا جاتا ہے"۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے مدیر عابد علی خاں نے فرمایا کہ
ے خیال میں اردو والوں میں اتحاد نہیں ہے۔

۲۹ دسمبر کو اردو ادب کے چالیس سال" کے موضوع پر منعقد سیمینار کا پہلا اجلاس ناول، افسانہ
ہ کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ صدارت قرۃ العین حیدر نے اور نظامت سلام بن رزاق نے فرمائی۔ سیمینار کا
قالہ ڈاکٹر صغرا مہدی نے "ناول اور افسانہ میں خواتین کا حصہ" اور دوسرا پروفیسر زاہدہ زیدی نے "اردو
مہ" کے عنوان سے پیش کیا۔ دونوں مقالوں پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سوال اٹھایا
وجہ ہے کہ اردو میں ڈراموں کی ایک طویل روایت کے باوجود وہ ہماری بیانیہ کا حصہ نہیں بن سکا؟ اور
لیا سبب ہے کہ بعض ناولوں کو زمانے کی ایک سطح' ایک عہد میں عظیم ناول تسلیم کیا گیا اور اس کے بعد رد کر دیا گیا۔
یسر وارث علوی نے فرمایا کہ "اردو میں "انارکلی" کے علاوہ کوئی ایسا ڈرامہ نہیں ہے جس پر بحث کی جاسکے"۔
بلد رشید کا خیال تھا کہ اردو کے عام ڈرامہ نگاروں کو اسٹیج کی ضرورت اور لوازمات کا علم نہیں ہے۔ ڈرامہ خصوصاً
ناٹک ہمارے اجتماعی شعور کی تربیت میں بڑا اہم رول ادا کر سکتا ہے۔

شاعری پر منعقد دوسرے سیشن کی صدارت علی سردار جعفری نے اور نظامت ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے انجام
۔ "ساختیات اور شعریات" کے عنوان سے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے رومن جیکسن اور
سیئر کے لسانی تصورات سے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس میں کوئی کلام نہیں کہ ساختیات نے نئی تنقید'
تان لیوس کی تنقید اور ایسے تمام تنقیدی دبستانوں کے لیے ایک چیلنج پیدا کر دیا ہے۔ ان سب دبستانوں میں
ن کے بارے میں یہ عام مفروضہ ملتا ہے کہ زبان کوئی ایسی شئے ہے جس کے ذریعے حقیقت کا ادراک کیا جاسکتا ہے
ختیاتی فکر اس پر زور دیتی ہے کہ ساخت حقیقت کو پیدا کرتی ہے۔ یہ گویا ادب کے لسانی رازوں کو جاننے
وشش ہے"۔

شمس الرحمان فاروقی نے "غزل کا نیا منظر نامہ" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا' انھوں نے فرمایا کہ
شتہ چالیس برسوں میں نئی غزل پر دو نسلیں گذر چکی ہیں۔ اب تیسری نسل ہمارے سامنے ہے۔ پہلی نسل کے بہت
لوگ تو ہمارے درمیان ہی نہیں' اور جو ہیں وہ اب زوال پا چکے ہیں۔ ان سے کوئی شکایت نہیں' لیکن
سری نسل والوں سے شکوہ ہے کہ وہ اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو گئے۔ فاروقی صاحب نے جواب دیتے
ے فرمایا کہ میں کسی ادب کے بارے میں مدافعانہ رویہ رکھنے کے خلاف ہوں۔ ہم نوجوان پاکستانی شعراء

کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شعراء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ نئی نسل کو اپنا نقاد خود پیدا کرنا ہوگا۔ ان کے بعد پروفیسر وحید اختر نے "نئی نظم کا منظر نامہ" مقالہ پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اقبال اور جوش کی نظموں میں وحدتِ خیال نہیں ہے۔ اس لیے ان کی نظمیں، نظم کے پیمانے پر پوری نہیں اترتیں۔ ان کی نظموں میں ارتقائے فکر نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی نظموں سے بند کے بند بھی نکال دیے جائیں تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ترقی پسند دور کی بیشتر نظموں کو پروپیگنڈے کی شاعری قرار دیا۔

صدارتی تقریر میں علی سردار جعفری صاحب نے فرمایا کہ "ترقی پسند اور جدید شاعری کی کسوٹی یہ ہے کہ اشعار کتنے دلوں کو چھوتے ہیں اور یاد رہ جاتے ہیں۔ وہ شاعری جس کی نقاد تعریف کریں لازمی طور پر اچھی نہیں ہوتی، اور نہ وہ شاعری لازمی طور پر بری ہوتی ہے جس کو نقاد برا کہیں۔ اچھی شاعری وہی ہے جو پڑھنے اور سننے میں اچھی لگے، دلوں کو متاثر کرے۔

رات ساڑھے نو بجے ورلی نہرو سینٹر کے خوبصورت ہال میں اختر الایمان کے زیرِ صدارت کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، حسن نعیم، مظہر امام، عزیز قیسی، اختر سعید خان، زاہدہ زیدی، قاضی سلیم، بشر نواز، زبیر رضوی، بیکل اتساہی، بیگم ممتاز مرزا، قیصر الجعفری، افتخار امام، ظفر گورکھپوری، جاوید ناصر، ممتاز راشد، منشاء الرحمٰن منشا، انجم رومانی، رفیعہ شبنم عابدی، رباب جعفری، عبدالاحد ساز اور آخر میں صدر مشاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔ نظامت ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی تھی۔

سیمینار کے دوسرے دن ۳۰ ڈسمبر کو تنقید و تحقیق کے اجلاس کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی نے فرمائی۔ علی جواد زیدی نے "تنقید کے نئے پیمانے" اور ڈاکٹر سیدہ جعفر نے "تحقیق و تنقید میں خواتین کا حصہ" کے عنوان سے مقالات پڑھے۔ نظامت ڈاکٹر لونس اگاسکر نے کی۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے اپنے مقالے میں گزشتہ چالیس سال کے اہم تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیا اور تنقید کے لیے مثبت نکات بھی مرتب کیے۔ رشید حسن خان نے "تعلیمی اداروں میں ادبی تحقیق" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ہماری دانش گاہوں کے اردو شعبے عجیب صورتِ حال سے دوچار ہیں، اور اس صورتِ حال کا سیدھا تعلق ادبی تحقیق سے ہے۔" سیمینار کے آخری سیشن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے زیرِ صدارت پروفیسر وارث علوی نے "تنقید کے نئے زاویے"، ڈاکٹر خلیق انجم نے "آزادی کے بعد ہندوستان اور غیر ممالک میں اردو کی ترقی اور فروغ" کے عنوان پر مقالات پیش کیے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام مقالہ نگاروں، مہمانوں کی جانب سے مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈمی اور رابطہ کمیٹی کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ہارون رشید نے انجام دیے اور سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

"بھیونڈی میں اردو" ایک تاریخی سیمی نار

پچھلے دنوں بھیونڈی کی نہایت اہم قابلِ اعتبار و فعال بزم تکمیل رائٹرس گروپ کے زیرِ اہتمام "بھیونڈی میں اردو" اس عنوان کے تحت یک روزہ سیمی نار منعقد کیا گیا۔ اس سیمی نار کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے کسی اکیڈمی کا تعاون حاصل نہیں رہا۔ صرف انجمن فروغ تعلیم کے اراکین معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

یہ سیمی نار اپنی نوعیت کے اعتبار سے واحد تھا۔ کہ اس میں تحقیقی و تنقیدی مقالے پڑھے اور سنے گئے تکمیل رائٹرس گروپ کے صدر جناب اصغر حسین قریشی نے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ بھیونڈی یہ ایک ادبی مرکز کے طور پر اب ابھر رہا ہے اور اس علاقے میں اردو نے کیسی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ اس کے متعلق جاننے کیلئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمام مہمانان اور مقالہ نگار حضرات کا تعارف پیش کیا اور سامعین کا استقبال کیا۔ اور تکمیل رائٹرس گروپ کی روداد بیان کی۔

قرات کے بعد سب سے پہلے نوجوان مضمون نگار انور ملک مومن نے اپنا مقالہ "بھیونڈی کے مرحوم شعراء" سنایا۔ جو کافی چھان پھٹک کر تحریر کیا گیا تھا۔ اس میں مومن صاحب نے مرحوم شعراء کے کلام سے ان کا تعارف پیش کیا۔ ان کے بعد نوجوان افسانہ نگار منظر سلیم (مدیر تکمیل) نے اپنا تیکھا مضمون "بھیونڈی میں اردو صحافت" ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ بھیونڈی شہر اردو گڈھ تو ضرور ہے۔ مگر یہ ادبی گڈھ یا ادبی مرکز نہیں بن سکا ہے اس طرح انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس شہر سے کوئی بڑا صحافی پیدا نہیں ہو سکا۔ بعد ازاں بھیونڈی کے واحد انشائیہ نگار جناب رفیع انصاری نے اپنا مقالہ "بھیونڈی میں نثر نگاری" پیش کیا۔ اور انھوں نے آج تک کے نثر نگاروں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون خالص تحقیقی نوعیت کا تھا۔ اور بڑی عرق ریزی کے

ساتھ قلمبند کیا گیا تھا۔ ان کے بعد کلیان سے آئے ہوئے مہمان جناب غلام نبی مومن نے اپنا مقالہ "بھیونڈی کی ادبی و ثقافتی انجمنیں اور سماجی ادارے" پیش کیا۔ یہ مضمون معلوماتی تحقیقی اور خشک ہونے کے باوجود دلچسپی سے سنا گیا۔

بھیونڈی کے ایک اہم افسانہ نگار مشتاق رضا نے بھیونڈی میں تعلیم و تدریس کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ جس میں تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کو سنبھالنے کے لیے کچھ تجاویز پیش کیں۔ اور خاص طور پر اسکول بورڈ اور ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں کرپشن سے پردہ اٹھایا۔ اس مقالے کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ کیوں کہ مشتاق رضا صاحب نے کچھ سچائیوں کی نقاب کشائی کی تھی۔ اس سیمی نار کا آخری مقالہ جان عالم رہبر صاحب نے پڑھا جس کا عنوان "بھیونڈی کے بہ قید حیات شعراء" تھا۔ یہ مضمون تعارفی تھا۔ اس میں انھوں نے بڑے موثر انداز میں اشعار کے حوالوں کے ساتھ شعراء کی مرقع کشی کی تھی۔ یہ مضمون کافی طویل تھا اور نامکمل بھی۔ کیوں کہ اس میں بھیونڈی کے تمام شعراء کا ذکر نہیں آسکا۔ بھیونڈی کی ایک اہم سماجی شخصیت (مہمان خصوصی) جناب یوسف حسن مومن نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہمیں سنجیدگی سے طباعت و اشاعت کے متعلق سوچنا چاہئیے۔ انھوں نے تکمیل رائٹرس گروپ کو مبارک باد پیش کی۔

آخر میں صدر جلسہ جناب یاسین مومن ایڈوکیٹ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ اردو اخبار یا رسالہ شائع کرنا اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ایک جنون کی ضرورت ہے اور سنجیدگی اور یکسوئی کی بھی۔

انہوں نے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی۔ اور تکمیل رائٹرس گروپ کے اس جذبے کو سراہا کہ انھوں نے بھیونڈی میں اپنی نوعیت کے واحد موضوع پر سیمینار منعقد کیا۔ انہوں نے آخر میں کہا کہ تکمیل رائٹرس گروپ بھیونڈی میں زبان وادب کے لئے ٹھوس کام کر رہی ہیں۔

اصغر حسین قریشی نے تمام مہمانان، سامعین اور انجمن فروغ تعلیم کے اراکین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ۱۷۴

"مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کا سیمینار"

مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو وارڈ کریلا کالج دالیولی میں " قومی یکجہتی اور اردو مراٹھی " کے موضوع پر سیمینار کا انعقا کیا گیا۔

صدارت ڈاکٹر یونس اگاسکر (شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی) نے کی۔ بدیع الزماں خاور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جناب شرف کمالی اور جناب ایوب ناڈکر نے اپنے مضامین پیش کئے۔ سلام بن رزاق کی کہانی "مستی" کالج کی طالبہ مس زہرہ مجراتے نے اور جناب محمود ایوبی کی کہانی " جنازہ " کو مراٹھی ترجمہ مس سنگیتا دلیے نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ جناب خالد آرائی نے قومی یکجہتی اور اردو کے موضوع پر مراٹھی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت اردو اکادمی کے ایگزیکیٹیو آفیسر وقار قادری نے کی۔ بعد ازاں جناب شرف کمالی کی زیر صدارت ایک اردو مراٹھی شعری نشست کا انعقاد ہوا۔ جس میں دلیپ پانڈھرے، پرویز بائی، شمس کردوی، وسنت کھوتے، ابراہیم آذر، اعجاز خان، مغل اقبال، وقار قادری، اور جناب شرف کمالی نے اپنا کلام پیش کیا۔

"جلیان والا باغ ـ ۹۰" کی دہلی میں بھی دھوم

ساہتیہ کلا پریشد (دہلی انتظامیہ) نئی دہلی کے تعاون سے ۲ر جنوری کی شام ۶½ بجے سری رام سینٹر نئی دہلی میں کردار آرٹ اکیڈمی بمبئی کا سیاسی طنزیہ فل لینتھ اردو ڈرامہ " جلیانوالہ باغ ۹۰ " پیش کیا گیا جس کے مصنف اور ہدایت کار ہیں جناب اقبال نیازی۔ ہال دہلی کے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور دہلی کے ڈرامہ شائقین اور جرنلسٹ انگشت بدنداں تھے کہ بمبئی کا ایک انتہائی بولڈ ڈرامہ سیاسی جماعتوں پر اتنی بے باکی سے کیسے چوٹ کر رہا ہے۔؟ اور اپنی اس حیرت اور مسرت

اظہار ڈرامہ کے اختتام پر ناظرین نے اور صحافیوں نے تالیوں اور پُرشور آوازوں سے کیا۔ ساہتیہ کلا پریشد کے سیکریٹری نے آخر میں اتنا شاندار ڈرامہ کرنے پر ڈرامہ کے مصنف و ہدایت کار جناب اقبال نیازی کو گلدستہ، ایک خوبصورت گولڈن ٹرافی سے نوازا۔ دہلی کے سبھی انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات نے اس سیاسی طنزیہ بولڈ ڈرامے کو بہترین پروڈکشن قرار دیا۔ اور اپنے تبصروں میں اسے بیحد سراہا۔ دہلی اور راجستھان کے مختلف ڈرامہ گروپس نے اس ڈرامہ کے مزید شوز دہلی میں کرنے کی پیش کش بھی کی۔ ڈرامہ جلیاں والا باغ۔ ۹۰" ساہتیہ کلا پریشد نئی دہلی کے اولین طبع زاد ڈراموں کے فیسٹول میں پیش کیا گیا تھا جس میں دہلی، پنجاب اور یوپی کے اہم ڈرامہ نگاروں اور ہدایت کاروں کے ڈرامے پیش کیے گئے۔ بمبئی سے یہ اردو کا واحد ڈرامہ تھا جسے اس اہم فیسٹول میں نمائندگی کا موقع ملا۔

"جلیاں والا باغ۔ ۹۰" موجودہ سیاسی و سماجی صورتحال پر، فرقہ وارانہ ماحول پر اور حالاتِ حاضرہ پر ایک زبردست چوٹ ہے، جسے بہت بے باکی اور جرأت کے ساتھ اقبال نیازی اور ان کے ساتھیوں نے راجدھانی میں سینکڑوں عوام کے سامنے اسٹیج پر پیش کیا اور داد و تحسین وصول کی۔ اس ڈرامہ کے فن کاروں میں کویتا راٹھوڑ، جاوید اکرم، شفیق سعید، عبدالودود خان، فاروق غلام نبی، حامد داؤکر، رفیق گلاب، نثار خان، فرید احمد انصاری، اور شفیق خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ معاون ہدایت کار مظہر سلیم اور بیک اسٹیج پر ذاکر قریشی، برجیس فقیہہ نے بے حد محنت کی۔

ڈرامہ "جلیاں والا باغ۔ ۹۰" کی اسکرپٹ پر گذشتہ سال ڈرامہ نگار اقبال نیازی کو ساہتیہ کلا پریشد کے آل انڈیا ڈرامہ نگاری کے مقابلے میں اوّل انعام سے نوازا گیا تھا اور اس کے بعد ہی اسے اسٹیج پر کھیلنے کی دعوت دی گئی تھی۔ دہلی میں اس شاندار شو کی کامیابی کا سہرا بلاشبہ ڈرامے کے فن کاروں اور ڈرامہ کے مصنف و ہدایت کار کے سر جاتا ہے۔ اس مقبول و مشہور ڈرامہ کے شوز عنقریب مالیگاؤں، شولاپور، پونا اور بمبئی کے مختلف تھیٹرز میں ہوں گے۔

خمیازہ کی رسم اجراء

گذشتہ دنوں انجمن فروغِ تعلیم کے زیر اہتمام بھیونڈی کے واحد انشائیہ نگار محمد رفیع انصاری کے اوّلین انشائیوں کے مجموعہ خمیازہ کی رسم اجراء کی تقریب ایڈوکیٹ مومن عبدالرشید طاہر (صدر بلدیہ بھیونڈی میونسپل کونسل) کی زیر صدارت منعقد ہوئی

خمیازہ کی رسم اجراء جناب یوسف ناظم صاحب کے دستِ مبارک سے ہوئی جناب غلام نبی صاحب نے مہمانان کا تعارف کروایا۔

جناب اسحاق خضر، پروفیسر عرفان فقیہ، محترمہ رفیعہ شبنم عابدی، جناب ہارون رشید علیگ، ڈاکٹر نظام الدین گوریکر۔ جناب یوسف ناظم نے اپنے خیالات سامعین کے سامنے پیش کئے۔

ناظم جلسہ جناب اقبال عثمان مومن نے انجمن کی جانب سے مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریب کے اختتام کا اعلان کیا۔

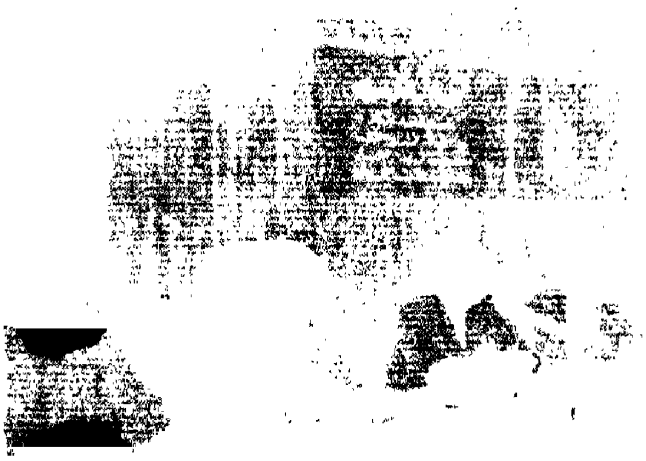
بھیونڈی میں مقابلۂ قرأت و نعت خوانی

"انجمن فروغِ علم وفن" کی جانب سے بھیونڈی تعلقہ قرأت و نعت خوانی مقابلہ (نئی بستی) منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز قاری عبدالسلام صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ صدارت شبیر احمد راہی صاحب نے کی۔ صدر انجمن شفیق احمد شیخ صاحب نے استقبالیہ کلمات اور مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ اس مقابلے میں بھیونڈی تعلقہ کے عربی مدارس اور اسکولوں کے طلبہ وطالبات نے حصّہ لیا۔ بحیثیت مہمانانِ خصوصی عبدالمجید خان صاحب، ڈاکٹر عبدالسلام انصاری (ایم ڈی) الحاج عبداللطیف صاحب اور محمد ہارون صاحب نے شرکت فرمائی۔

مقابلہ قرأت میں قاری عبدالسلام، قاری غوث محمد اور قاری سعیدالرحمٰن صاحبان نے اور مقابلہ نعت خوانی میں مختار عالمگیری، شبیر انجم اور قاری سعیدالرحمٰن صاحبان نے جج کے فرائض انجام دیے۔ انعام یافتگان کو مرحوم مبین ماسٹر کپ کے علاوہ مقابلے میں شریک طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام انصاری (ایم ڈی)، ڈاکٹر شاہد مستری اور مالک ناز الیکٹرک اینڈ جنرل اسٹور کی جانب سے دینی کتابیں دی گئیں۔

عبدالاحد ساز کی "خموشی بول اٹھی ہے"

پچھلے دنوں عبدالاحد ساز کے اولین مجموعۂ کلام "خموشی بول اٹھی ہے" کا اجرا بدست جناب جالب مظاہری عمل میں آیا۔ نشست کی صدارت جناب علی سردار جعفری نے فرمائی۔ آغاز میں الیاس شوقی نے اپنے مضمون میں ساز کے تخلیقی رویے پر روشنی ڈالی۔ مدیر "شاعر" افتخار امام صدیقی نے صاحبِ کتاب سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ہندوپاک کے مقتدر رسائل میں ساز کے کلام کی اشاعت پر گفتگو کی۔ جاوید ناصر نے جو بطورِ خاص اس نشست میں شرکت کے لیے ناگپور سے تشریف لائے تھے، اپنے تنقیدی مضمون میں اس بات کی نشان دہی کی کہ "وجود کا استفہامیہ شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور ساز اس کے متحمل بھی ہیں"۔ نعمان امام کے منظوم خراجِ تحسین کے بعد ندا فاضل یوں گویا ہوئے "ساز کی بعض شعری ترجیحات میرے مطالبات پر پوری نہیں اترتی۔ نیز یہ کہ موت کا تصور، خوف کی مختلف صورتوں میں ساز کے ہاں ملتا ہے۔ شاید اسی لیے آگے چل کر ان کے ہاں آگہی کی راہیں نکلیں"۔ عزیز قیسی صاحب نے ساز سے ایک سینیئر شاعر ہونے کی حیثیت سے کہ ساز کے ہاں زبان و بیان پر یعنی کیسے کہا جائے



دائیں سے: علی سردار جعفری، جالب مظاہری، عزیز قیسی، ندا فاضل (مائیک پر) عبدالاحد ساز، نظام الدین نظام، اور علی ایم۔ شمسی وغیرہ ـــــ

برخاص قدرت ہے مگر کیا کہا جائے کہ بارے میں ابھی کنفیوژن ہے۔ ساز کی شاعری اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کے ساتھ لکھا جائے۔ مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا مضمون سنایا اور اس حسنِ اتفاق کی طرف توجہ مبذول کی 'یہ شاعر اکتوبر ۱۹۹۰ء میں چالیس سال کا ہو گیا اور اس کے فوراً بعد مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے ۴۰ سالہ اردو ادب پر ایک سمینار منعقد کیا۔

اظہارِ خیال کے سلسلے کے بعد کتاب کا اجراء کرتے ہوئے جناب طالب مظاہری نے فرمایا۔ ساز کی ذہنی و ادبی تربیت میں میرا بھرپور ہاتھ رہا' مگر وہ بہ اعتبارِ شاعر میری استادی و شاگردی کے رشتے سے آزاد ہی رہے اور اپنی طبعِ رواں کو ہی کو رہبر بنایا۔

اجراء کی خوش گوار رسم کے بعد جناب مجروح سلطان پوری نے ساز کی شاعری کو پسند کرتے ہوئے فرمایا کہ "لوگ عام طور پر جسے روایت سے انحراف سمجھتے ہیں وہ دراصل روایت سے اختلاف ہے' جو کہ روایت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مستحسن عمل ہے۔ ساز کے ہاں یہ عمل موجود ہے' مگر میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے شعری سفر میں اس عمل کو احتیاط سے برتیں خاص کر زبان و بیان کے معاملے میں"۔ خطبۂ صدارت سے پہلے ساز نے اپنے جذباتِ تشکر کا اظہار کیا اور حاضرین کے کہنے پر اپنی نظم "آخری پیام" سنائی۔

آخر میں صدرِ نشست جناب علی سردار جعفری نے یہ تاریخی بیان دیا کہ "عبدالاحد ساز کو میں نے اس عالم میں پڑھا کہ میں گزشتہ ایک ماہ سے ایک ہی شاعر فردوسی کو پڑھ رہا تھا۔ جب میں فردوسی کا "شاہ نامہ" پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تھا تو ساز کی کتاب اٹھا لیتا تھا اور اس کے باوجود مجھے ساز کی شاعری ناگوار نہیں گزری۔ یہ بات بجائے خود ساز کی شاعری کے حق میں ایک تحسین ہے۔ ان کی شاعری میں لطافت بھی ہے' نرمی بھی ہے' جمالیاتی کیف بھی ہے اور تلخ کلامی بھی ہے' اور یہ عناصر کسی بھی اچھے شاعر کے ہاں ضرور ہوتے ہیں۔

—— اراکینِ اردو رائٹرس گلڈ نے سامعین و شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

جاوید ظفر شیلڈ تقریری مقابلہ

گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی جاوید ظفر شیلڈ تقریری مقابلہ انڈین یوتھ ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام احمد سیلر ہائی اسکول میں منعقد ہوا۔ جس میں بمبئی اور بمبئی کے مضافات کے اسکولوں نے حصہ لیا۔

تقریری مقابلے کی صدارت جناب ظفر گورکھپوری نے فرمائی۔ جناب عبدالاحد ساز، جناب الیاس شوقی اور جناب عالم ندوی نے جج کے فرائض انجام دیئے۔ اناؤنسنگ کے فرائض جناب رفیق گلاب نے انجام دیئے۔ ججوں کے متفقہ فیصلے سے تقریری مقابلہ اوّل انعام اور جاوید ظفر شیلڈ فاروق ستار ہائی اسکول کو سونپی گئی۔

نعرہ بکتا ہے (اردو ڈرامہ)

گذشتہ دنوں ماٹونگا کے کرناٹک سنگھ ہال میں سہیل آرٹس کے زیرِ اہتمام ایک نہایت ہی صاف ستھرا اور سماجی وسیاسی پس منظر میں تحریر کردہ فل لینتھ ڈرامہ "نعرہ بکتا ہے" پیش کیا گیا۔ اس ڈرامہ کو اشتیاق زخمی صاحب نے تحریر کیا تھا۔ اشتیاق زخمی نوجوان اور ابھرتے قلم کار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے اداکار بھی ہیں۔ اس ڈرامہ کو ہدایت سے سنوارا تھا عمر خان صاحب نے، جو ایک اچھے اور سلجھے ہوئے ہدایت کار ہیں اور ساتھ ہی ایکٹر بھی۔

دیگر اداکاران میں طیب قریشی، واجہ گوتم، طاہر علی، شراونی گوسوامی، عمر خان، محمد خالد، رام کمر، ڈیکر، ایس۔ایس جوہر، ماجد بریلوی، مینو شاہ، اور غلام بھائی زری والا نے اس ڈرامہ کو خوب صورت اور کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ ●●

ہدایت نامے

شمس الرحمٰن فاروقی — لکھنؤ

تحریل کا شمارہ نمبر ۸ ملا شکریہ۔ مقدر حمید صاحب نے اپنے بارے میں خوب لکھا ہے اس منزل سے کم لوگ کامیاب آتے ہیں۔ انھیں میری طرف سے مبارک باد دیں۔ "Money Plant" کا ترجمہ زریبل بھی خوب ہے۔

عصمت جاوید — اورنگ آباد

مکرمی! تحریل کا تازہ ترین شمارہ ملا اور آپ کا محبت نامہ بھی۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایسے دور میں جب اردو زبان بحرانی دور سے گذر رہی ہے۔ آپ صرف ایک ادبی رسالہ نکال رہے ہیں بلکہ اس کا معیار بلند رکھنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ "چراغ چشم تر" پر نظام صدیقی کا مقالہ (میں اسے تبصرہ نہیں کہوں گا) بہت پسند آیا۔ میں بذات خود اس شعری مجموعے کو اردو کے رثائی ادب میں اونچا مقام دینے کے حق میں ہوں۔ ظفر نے ذاتی غم کو آفاقی یا کائناتی غم بنانے میں کسی میکانیکی فارمولے سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس عمل میں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔

نظام صدیقی نے اس عظیم شعری تخلیق کی ادبی عظمت کا نقش ابھارنے کے سلسلے میں اپنی تنقیدی بصیرت اور وسعت علمی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب وہ مشق و مہارت سے اپنے اسلوب کے کھردرے پن کو دور کرلیں گے اور اپنی وسعت علمی کے گھوڑے کی لگام اپنے ہاتھوں میں

ھتا سیکھ جائیں گے تو آئندہ بہت بڑے نقاد بنیں گے۔ این بی آرزی۔
گیارہویں کتاب پر نجم الثاقب سخنہ کا تبصرہ طلبہ کے لئے کارآمد ثابت ہوگا
سلسلے کو جاری رکھیئے۔ اس سے قبل تکمیل کا شاذ تمکنت نمبر بھی نہا ص
چیز تھا۔ خدا تکمیل کو حالات کے تھپیڑوں اور نظر بد سے محفوظ رکھے۔

جوگندر پال — دہلی

میں ادھر بہت دنوں گھر سے باہر رہا لوٹنے پر آپ کا تکمیل نمبر ملا ہے
کریہ۔ میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے اسے پڑھا ہے۔ ذہنی تربیتوں
کے لئے اچھے رسائل بھی بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ امر بہت مستحسن ہے
کہ آپ اتنی محنت، لگن اور ذہانت سے اس اہم رول سے عہدہ برآ ہو رہے
ہیں۔ خدا آپ کا حوصلہ بنائے رکھے۔ اُمید ہے کہ آپ اور مظہر سلیم بہ عافیت
مسرت ہوں گے۔

شفق — سہسرام (بہار)

تکمیل کا تیسرا شمارہ ملا پھر خط ملا۔ اس سے قبل دو شمارے مل چکے
ہیں۔ تکمیل اچھا نکل رہا ہے۔ آپ لوگ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی
کوشش کر رہے ہیں نیا شمارہ پچھلے سے بہتر ہوتا ہے۔ کتابت و طباعت
اور مواد کے اعتبار سے بھی ہر شمارہ میں کوئی چیز رسالہ کی اہمیت میں
اضافہ کرتی ہے۔

علی جواد زیدی — بمبئی

تکمیل شمارہ نمبر ۱ ملا یاد آوری کا شکریہ۔ ایسا صاف ستھرا رسالہ
نکالنا اور ادبی معیار بھی قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ کامیابی پر مبارکباد
قبول کیجئے۔ مشمولات میں تنوع بھی ہے اور اچھے علاقائی اردو ادب سے

اردو والوں کے وسیع تر حلقوں کو متعارف کرانے کی مستحسن کوشش بھی اس سلسلے کو جاری رکھیے کل ہند سطح کی بلندی علاقائی سطح ادب کی بلندی پر ہی منحصر ہے۔

شام بارک پوری بنگلہ دیش

تکمیل کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ گوشہ مقدر حمید نکال کر آپ روایت شکن ہوگئے۔ اکثر مرحوم مصنف پر نمبر یا گوشہ نکالا جاتا رہا ہے۔ مگر چند رسالوں میں بڑی تبدیلی آتی ہے۔ چند رسالوں نے تخلیق کار کی زندگی ہی میں اس کی صلاحیت اور اہمیت کو منظر عام پر لاکر حقیقت کو غلط ثابت کردیا ہے کہ ہم مردہ پرست نہیں ہیں

احمد وصی بمبئی

آپ کا تکمیل پاکر پڑھنے بیٹھ گیا۔ مضامین میں جمیل مظہری پر لکھا گیا مضمون اچھا لگا۔ آج ضرورت اس کی ہی ہے کہ ان پر لکھا جائے جو اس کے مستحق ہیں اور جن پر کم لکھا گیا۔ اس بار نظمیں کم اور غزلیں زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ میری ایک غزل کا ایک مصرع کتابت کی غلطی کا شکار ہوگیا۔ مصرع دراصل یوں ہے۔

"کہنے والے اپنی باتوں سے کتابیں بھر گئے"

کاتب نے بھر گئے کو چلا گئے کردیا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح مصرع بحر سے خارج ہوگیا۔ برائے مہربانی یہ خط شائع کرکے اسکی تصحیح کردیں۔ افسانے میں کم پڑھتا ہوں۔ ابھی تک اس شمارہ کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا۔

جلیل ساز ناگپور

تکمیل کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ اس سے پہلے کا بھی تکمیل مجھے مل چکا ہے۔ شکریہ۔ محنت اور جانفشانی سے عبارت یہ پرچہ

اگرچہ لکھنؤ، دہلی، یا حیدرآباد سے شائع ہوتا تو دھوم مچ جاتی اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ مگر ہم مہاراشٹر میں بسنے والے اردو دوست، خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے ہماری بے حسی دور کرے کہ ہم اپنے علاقے کے جی داران ادب کی بیش بہا خدمات کی قدر کرتے ہوتے انکے کاز میں کچھ تو اپنا لہو بھی نذر کرسکیں۔ آپ کا اداریہ یقیناً مناسب ہے۔ کڑوا سچ ہے خدا کرے کچھ لوگ تو چونکیں۔ میرے لائق دامے درمے قدمے سخنے جو بھی کام ہوں بلا تکلف لکھیں۔

سلطان سبحانی — مالیگاؤں

تکمیل کا نیا شمارہ (گوشۂ مقدر حمید) دستیاب ہوا۔ شکریہ۔ مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ تکمیل معیار کی سیڑھیوں پر قدم بہ قدم بلند ہوتا جارہا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے لیکن یہ وہ سیڑھیاں ہیں جن کا کوئی آخری سرا نہیں ہے اور جو کہیں بھی ختم نہیں ہوتیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ معیار ایسی شئے ہے جس کی تعریف خود معیار والے بھی نہیں کرسکے لہٰذا یہ کہہ کر بات ختم کرتا ہوں کہ تکمیل کا آگے بڑھنا اور بڑھتے رہنا بھی ایک معیار ہے۔

اس بار تکمیل میں تین افسانے شریک ہیں۔

فٹ بال کے میچ پر شام بارک پوری کا افسانہ ''کرتب'' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ افسانے صرف لکھے ہی نہیں جاتے بلکہ کھیلے بھی جاتے ہیں۔ افسانہ یوں چلا ہے کہ اسٹیڈیم اور کھلاڑی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ سبز اور سرخ ٹیم شمال مشرق، جنوب ریفری، اور فٹ بال فیڈریشن کمیٹی وغیرہ لباس علامت کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

افسانہ'' الیغل نادر'' میں بنت مسعود نے ایک نہایت ہی لطیف موضوع کو چھیڑا ہے۔ مرکزی کردار کے آئیڈیل کا خوابوں سے حقیقت کی طرف ظہور اور احساسات کی تجسیم سے لمس کی سحر انگیزی تک ایک خوبصورت تکمیل

کی آواز ہے۔ یہ افسانہ بہتر ہے لیکن میں ایسا سمجھتا ہوں کہ سزا و جزا کا سلسلہ ہندوستان میں بھی ہے اور یہ اتنا وسیع ملک ہے کہ کسی افسانے کے لئے ہمیں باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

مقدر حمید کا افسانہ "ڈیموکلس کی تلوار" تلوار ہی کی طرح ہے۔ اور ایک عمدہ موضوع کے گرد گھومتا ہے۔ افسانہ نگار کا سفر حقیقت نگاری کی طرف ہے۔ سچویشن کہیں کہیں ڈرامائی ہے لیکن افسانہ کی پیش قدمی طنز کی جانب ہے۔ اس افسانہ میں مقدر حمید نے ادب، سیاست، سماج اور بزنس وغیرہ بہت کچھ سمیٹ لیا ہے اور بقول یوسف ناظم "اڑان کی کیفیت" (بھی) موجود ہے لیکن میری دانست میں اونچائی کے لئے وہ سیڑھی بہترین ذریعہ ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتی۔

گوشۂ مقدر حمید میں یوسف ناظم، محافظ حیدر، سلام بن رزاق اور انور قمر کے اظہارات عمدہ ہیں اور مقدر حمید کے فن پر چاروں سمت سے روشنی ڈالتے ہیں۔ "مقدرات" صاف گوئی و حق بیانی کی رو سے بہترین خود نوشتہ خاکے ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور اثر انگیز بھی۔

آخر میں ایک بات ضرور کہوں گا کہ اس شمارے کے مطالعہ کے دوران پروف ریڈر کی کمی کا شدت سے اندازہ ہوا۔ ویسے یہ تو ہر رسالے کے مقدر کی بات ہے

نور الحسنین

اورنگ آباد

تکمیل تو باضابطہ ہی مجھے ملتا ہے۔ تازہ شمارہ بھی ملا۔ کتابت در طباعت کے لحاظ سے اب کی بار تو تم نے میدان مار لیا۔ اس پریشان ن حالات میں یہ بتاؤ تم رسالہ کس طرح نکال رہے ہو۔ جوان آدمی ہونا س لئے بھاگ دوڑ اور مسائل جھیلنے کی ہمت ہے تم میں۔ میں تو تمہارے

تمہارے لئے بھی دعا کروں گا کہ خدا تمہیں ہمیشہ ہی جوان رکھے۔ اور تکمیل بھی یوں ہی جاری و ساری رہے ۔

جینت پرمار
احمد آباد

برادرِ عزیز ۔ آداب!

تکمیل کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ دعا گو ہوں کہ یہ سنجیدہ صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ نکلتا رہے ۔ اس کے ساتھ ایک جز[redacted]سال ۔ بنا [redacted] گے

سلیم شہزاد
مالیگاؤں

مجھے تکمیل کا دسواں شمارہ نہیں ملا جو تم نے بھیجا تھا۔ شبیر آصف نے کہا تھا کہ اس میں نظام صدیقی الہ آبادی کا کوئی مزیدار مضمون ہے۔ اب نئے شمارے میں اس پر نعمان امام، غلام نبی مومن صاحبان کے متضاد خیالات ۔ آصف سے پرچہ لے کر پڑھوں گا ۔ پڑھا تو نہیں جا سکتا اس شخص کا کوئی مضمون لیکن جبراً پڑھ لیتا ہوں کہ زبان کا ایک طالب علم ہوں۔ نظام کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کا خون کس کس بادیے ہتھیار سے کیا جا سکتا ہے (میں یہ ہتھیار چلانا نہیں چاہتا) یہ عمل تو نظام صاحب ہی کو مبارک ہو، تا نہیں نعمان امام کو کہاں علیم خلاقی، تخلیقی فنکاری، تدریجیاتی اور وغیرہ وغیرہ خوبیاں نظر آگئیں آپ سوچیں گے، مضمون پڑھے بغیر ہی نعمان امام کے خیالات سے غیر متفق کیوں ہو رہا ہوں تو عرض ہے کہ نظام کے کسی مضمون میں یہ خواص پائے ہی نہیں جاتے۔ البتہ یت، یات، یاتی، جیسے لاحقوں کی بھرمار فرزندان کے گراں قدر آمیزہ الفاظ میں مل جاتی ہے۔ جس کی طرف نہایت مخلصانہ اشارے بھائی غلام نبی مومن نے کیے ہیں ۔ اور پہلا پتھر مارنے کے لیے میں انھیں مبارک باد دیتا ہوں! دراصل یہ شخص ادب میں تنقید، معنویت اور تخلیقیت (اس یت کے لیے معاف کریں) کے ذریعے اسٹنٹ پھیلانے کی تحریک چلا رہا ہے، اور معصوم شعراء اور افسانہ نویسوں سے لے کر بعض خود ساختہ دیدہ بر خود غلط مدیرانِ رسائل بھی اس کے رعب میں آئے ہوئے ہیں! ایسا اس لیے ہے کہ مقالے کے ساتھ پھیلے (جس کا ادبی رسائل کے مدیروں کو قحط نظر آتا ہے۔) یہ شخص لمبا چوڑا ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا لفظ لکھوں ۔ نظام صدیقی ہوتے تو فوراً یت یا یات، اصطلاح گھڑ لیتے۔ بھیج دیتا ہے۔ مدیر تکمیل

بر خود غلط مارے خوشی کے پھولے جاتے ہیں کہ پرچے کی غذا کا انتظام ہوگیا۔

ابراہیم اشک نے بھی اس مضمون پر کچھ کہہ گزرنے کی جرأت کی ہے۔ لیکن انھیں افسانہ نگار بننے کا مشورہ غلط دیا ہے، کیوں کہ پہلے ہی یہ شخص افسانہ لکھ کر معروف ہو چکا ہے۔ دراصل سیدھے سبھاؤ، تخلیق یا تنقیدی کام کرتے رہنے سے شہرت ایک زمانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ (اور وہ بھی نصیب میں ہو تو) ورنہ راتوں رات مشہور ہونے کے لیے آپ کسی دیہاتی شاعر کی شاعری پر چالیس صفحات لکھ ماریے، نظام کی طرح تخلیقیت کی چکّی چلا دیجیے، شہرت آپ کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائے گی۔ (افسوس تو یہ ہے کہ اسٹنٹ بازی کے باوجود جناب مشہور نہیں ہو پا رہے ہیں) البتہ چند حلقوں میں بدنام ضرور ہیں) مجھے ان سے ذاتی مخاصمت نہیں ہے نہ ان سے تعلق ہے۔ نہ خدا کرے کبھی ہوں، لیکن ایسی الم غلم تنقید جس سے افتخار جالب اور عادل منصور کی شاعری کہیں بہتر ہے۔ پڑھ کر زبانِ اردو کے دن بھرتے نظر آتے ہیں۔ شاید نویں شمارے میں شحنہ صاحب نے این سی ای آر ٹی کی کتابوں کی دھول جھاڑی تھی اور خوب جھاڑی تھی، بہت محنت سے لکھا ہے، اور میں تو کہوں گا کہ اسی طرح انھیں نظام صدیقی کی خبر بھی لینی چاہیے۔

قمر احسن — دھلی

عرصہ کے بعد تحلیل کا شمارہ دیکھا۔ جب تک شمس الرحمان فاروقی صاحب دہلی میں تھے ان سے مل جاتا تھا۔ اب آپ نے نوازش کی ممنون ہوں۔ ادبی پرچوں کی کساد بازاری میں پرچہ نکالتے رہنا اور تخلیقی ادب کی طرف متوجہ رہنا بڑی اہمت کا کام ہے اب تو ہم سب معاملاتِ ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے افسانوں کا دوسرا انتخاب "شیر آہو خانہ" چھپ گیا ہے۔ جسے نشاط پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ کل یا پرسوں آپ کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔

میرا پتہ۔ قمر احسن۔ سی۔ ۵۴۷، لکشمی بائی نگر۔ نیو دھلی نمبر ۱

پرکاش چندر — لکھنؤ

شمارہ گیارہ میں ابراہیم اشک صاحب کا مضمون فیض کے متعلق پڑھا ہر ایک کو اپنی رائے دینے کا حق تو ہے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ان کے کیچڑ اچھالنے پر صرف اشک ہی بہائے جا سکتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ فیض ایک اہم شاعر تھے نا کہ عظیم

لیکن ابراہیم اشک کو یہ سب زیبا نہیں دیتا۔ فیض کو اس طرح لتاڑ کر وہ عظمت نہیں پا سکتے۔ یہ تو سستی شہرت کا ایک حربہ ہے جن شاعروں کو اشک آئیڈیل بنانا چاہتے ہیں مثلاً میر، غالب، مومن، اقبال، آتش اور یگانہ یہ سب اگر فیض کی طرح زندگی بسر کرتے اور انہیں حالات سے ٹکراتے جو فیض کے سامنے آئے تو وہ بھی سیاست سے الگ نہ رہتے خیر، چاند پر تھوکنے والے نایاب نہیں ہیں یہ اشک نے ثابت کر دیا ہے۔

رئیس الدین رئیس علی گڑھ

تکمیل کا شمارہ نمبر ۱۱ موصول ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ تکمیل عصری ادب کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ترتیب و انتخاب تکمیل کی انفرادیت کے ثبوت میں رکھی جا سکتی ہے۔ اور یہ بڑا جامع اور حقیقت کا عکاس ہے۔ زیر نظر شمارے میں شاعر کی بیاض کے تحت نعمان امام کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ لیکن عبداللہ کمال کے اس جملے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ

"جب کہ نئی شاعری اپنے عزدواضح خدو خال میں نئے موسموں اور نئی جہتوں کے آب و رنگ بھر رہی تھی۔ اس وقت نعمان امام کے بیشتر ہم عصر شاعر نہ تو ان موسموں کے قدموں کی دھمک سننے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ہی ان جہتوں کے اسرار سے پوری طرح آگاہ تھے۔"

ظ انصاری مرحوم کا خط پڑھ کر مرحوم کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ مضامین میں ڈاکٹر حبیب الرحمان کا جمیل مظہری اور ان کا پیمانۂ تخیل بھرپور رہے۔ تینوں کہانیاں اچھی ہیں۔ غزلیات میں تمام ہی غزلیں تکمیل کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

سلیم انصاری جبل پور

تکمیل کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ پیش نظر شمارے میں جناب ابراہیم اشک کا مضمون خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اتنی بے باک تحریر شاذ و نادر ہی دیکھنے ملتی ہے۔ نعمان امام کی غزلوں میں تازگی محسوس ہوئی اس کے علاوہ رؤف خیر کی

غزلیں اردو کے نئے شعری امکانات کا منظرنامہ ہیں
این سی آر ٹی کی گیارھویں کتاب پر تحقیقی مضمون بے حد معلوماتی ہے۔

محمد امین بھٹولے **کرلا بمبئی**

نیا شمارہ ملا۔ گذشتہ تمام شماروں کی بہت سی خامیوں کو ہٹا کر گویا یہ شمارہ تکمیل کے آئندہ اس سے بہتر آنے والے شماروں کی نمائندگی کرتا ہے "چراغِ چشم تر" میں نظام صدیقی صاحب نے تخلیق کے عناصر تلاش کرنے ایسی صلاحیت خرچ کردی ہیں چراغِ چشم تر کی تفہیم میں یہ مضمون معاون ثابت نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح مقدر حمید صاحب کی زربیل پر اقبال نیازی صاحب نے جو گفتگو مرتب کی ہے مجھ ناچیز کے خیال میں "زربیل" کے مطالعہ سے پیشتر اسے پڑھنا از حد ضروری ہے۔ کہانیوں اور غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ایک گذارش ہے کہ بعض آزاد نظموں کی تفہیم کے لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ بھی تحریر کیا جائے کہ کس موقع پر لکھی گئی ہیں تو آسانی ہوگی۔ سرورق اور آخری صفحہ مزید خوب صورت بنایا جا سکتا ہے۔ تازہ شمارے میں اگر ایسا ہی ہو تو کیا خوب ہے دیکھیں آپ کی نظر کہاں ٹھہرتی ہے۔

حامد داؤکر **اندھیری، بمبئی**

تکمیل کا تازہ شمارہ ملا۔ گذشتہ خامیوں کا ازالہ کرتے ہوئے تکمیل کی تکمیل کی گئی ہے۔ این سی۔ آر۔ ٹی کی گیارھویں کتاب کا جائزہ معلومات کے ذخیرہ میں اضافہ کا باعث بنا۔ اس طرح کے تعلیم و تدریس سے متعلق مضامین شائع کئے جائیں تو بہتر ہوگا۔ زربیل پر یوسف ناظم صاحب کا مضمون قابلِ تعریف ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ گوشۂ مقدر حمید پر اقبال نیازی صاحب کو بھی مبارکباد۔ علی ظہیر کی نظم "نئے دکھ میل

بھیونڈی

کی تلاش" اور مظہر سلیم صاحب کا یادِ بسیرے پر تبصرہ خوب ہے۔
یہ ادبی جریدہ عصری ادب کے تقاضوں کو مکمل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس سے مدیران کی محنت اور حوصلوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ سرورق کو اور خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ تحریروں کی کئی جگہوں پر نمایاں نظر آتیں لیکن نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

غلام قادر خان　　　　ساٹا کروز ممبئی

تکمیل کا تازہ شمارہ ملا۔ تکمیل کے وسیلے سے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کچھ جانے انجانے نام بھی پڑھنے کو ملے۔
مقدر حمید کا گوشہ پسند آیا۔ آج ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ نئے اور نوجوان قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے، یہ سلسلہ اچھا ہے۔
تکمیل اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ رسالہ اب اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں سے رسالے اپنی شناخت بناتے ہیں، اپنی انفرادیت کا لوہا منواتے ہیں خدا آپ کے ارادوں میں مزید تقویت بخشے آپ اس طرح بذریعہ تکمیل اردو کی خدمت کرتے رہیں۔ ہر پرچہ اپنے میں خوبیاں و کوتاہیاں لے کر آتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر رسالہ اچھا ہے مگر میری ناقص رائے ہے کہ آپ شخصیت سے متاثر ہو کر دوستی کا شکار ہو کر اپنے رسالے کے معیار کو نہ گرائیں
تبصرات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جو تبصرے قصیدے کے زمرے میں آتے ہوں انھیں بنام قصیدہ شائع کریں جیسا کہ پچھلے شمارے میں نظام صدیقی کا تبصرہ تھا۔
تکمیل کی ترتیب و تزئین، معیار اور اس سے جھلکتی آپ کی محنت سے مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ مستقبل میں ضرور کچھ کر جائیں گے۔
●●

سہ ماہی تکمیل بھیونڈی

فارم نمبر ۴ بابت VIII

سٹریشن نمبر : ۸۸/ٹی سی/اے۔ایل/۳۰/۸۲۸، ۲۵۱۴۸ ۷

ام اشاعت : گلزار نگر، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی، ۲۰۲ ۴۲۱، تھانے

یت اشاعت : سہ ماہی

پرنٹر، پبلی شر : اصغر حسین قریشی قومیت : ہندوستانی

تہ : گلزار نگر، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی، ۴۲۱۳۰۲، تھانے

ایڈیٹر : مظہر سلیم قومیت : ہندوستانی

تہ : سی/۱۵/۱۱ کُنتی دیوی چال، دلوباجاوے نگر، پائپ روڈ کرلا، بمبئی ۷۰

پتہ مالک رسالہ : اصغر حسین قریشی، گلزار نگر، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی، ۴۲۱۳۰۲، تھانے

ضروری اعلان

ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ سہ ماہی تکمیل کے
ذ تمکنت نمبر کو بہت پسند کیا گیا، اور آج تک اس نمبر کے لیے بے شمار آرڈر اور خطوط موصول
ہو رہے ہیں۔ قارئین کے بے حد اصرار پر شاذ تمکنت نمبر کا دوسرا ایڈیشن آفسیٹ پر جلد ہی
ئع کیا جائے گا۔ قارئین اور ایجنٹ حضرات اپنے آرڈرس جلد بک کرالیں ادارہ

"میل میں وہی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں، جن سے ادارہ متفق ہوتا ہے"

(بقیہ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار)

آزاد کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پھر بھی اتنی بات ضرور کہوں گا کہ قاضی عبدالغفار کا آثارِ ابوالکلام آزاد پڑھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ شرحِ صدر ہو نہ ہو، دل کی کلیاں ضرور کھل جاتی ہیں۔ ●●

(بقیہ۔ قرۃ العین کا سماجی شعور)

غرض قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں زر پرستی سے لے کر سر پرستی تک سماج کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ ان کے کردار سماجی زندگی کی پر پیچ راہوں سے گذرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنے انفرادی رویوں کے ساتھ ساتھ سماج کے عمومی رویوں پر بھی معنی خیز تبصرے کرتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ جس طرح قرۃ العین حیدر نے ناول نگاری میں فنّی مہارت کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر سماجی حقائق کے سلسلے میں اپنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو ادب میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ ●●

(بقیہ اردو کی نئی نصابی کتابیں)

اعتبار سے عمدہ نئی نصابی کتابیں کم ہی دیکھنے میں آئی ہیں آزادی کے بعد دراصل اردو نصابی کتابوں کو نئی ترتیب دینے اور نثری وشعری انتخابات کو نئی مشقوں کے ساتھ پیش کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ جسے اردو کی نئی نصابی کتابوں نے پورا کردیا ہے۔ قومی سطح پر اردو میں نصابی کتابوں کی نئی ترتیب و تدوین کے لئے بلاشبہ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ ــــ نئی دہلی۔ مبارکباد کی مستحق ہے۔

(بشکریہ ہماری زبان دہلی)

124906
31.8.96

بقیہ نظام الدین نظام۔ اپنی نظموں کی فضا میں

نظام خوب جانتے ہیں کہ ان کی پرواز کو منطقہ ہوا کی کس سطح پر جاکر استقرار حاصل کرنا ہے اور متوازن ہونا ہے۔ عمودی پرواز کی یہ منزل بہت قریب نہیں ہے تو بہت دور بھی نہیں۔ ●●

بیس برس کے تخلیقی مراحل کی روداد

خموشی بول اٹھی ہے



شائع ہو گئی ہے

عبدالاحد ساز

قیمت ۴۰ روپے

ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، جے جے، کورٹ بمبئی ۳

Dec 90 / MAR / June 91   VOL: 4 ISSU 12, 13, 14

TAKMEEL

Urdu Quarterly Bhiwandi 421 302 (M.S.) INDIA

Regd to RNI ... NO ... AL TC ...

صنعتی شہر بھیونڈی سے اپنی نوعیت کا واحد
ادبی رسالہ سہ ماہی "تکمیل" کے تین سال مکمل ہونے پر

دلی مبارکباد اور نیک خواہشات

منجانب : محمد فاروق

بالاجی کمیونی کیشنز ڈیلرس، ہینڈ
سپلائرس، ٹیلی کوم اسپیئر پارٹس
اینڈ کیبل کنٹراکٹرز ایم۔ ٹی۔ این۔ ایل
بمبئی اینڈ مہاراشٹر سرکل۔ وکھرولی بمبئی ۸۳
ٹیلی فون : ۴۳۶۷۵۳۲

سرورق : ضیا الیوبی